50

49

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ

اور یہ ایک کتاب ہے جسکو ہم نے بھیجا ہے، خیر و برکت والی ہے

تفسیر ابنِ جریر اردو

تالیف

امام ابو جعفر محمدؒ بن جریر طبری

اردو ترجمانی

ظہور الباری اعظمی

ناشر

بیت الحکمت دیوبند (یوپی)

Marfat.com

اردو زبان میں حدیث کی عظیم المرتبت کتاب صحیح بخاری کی کامل و مکمل شرح موسومہ

انوار الباری شرح اردو صحیح البخاری

مع مکمل عربی متن و اردو ترجمہ

مرتبہ مولانا سید احمد رضا صاحب (فاضل دیوبند) تلمیذ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب محدث کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز

"چودہ سو سال بعد 'آفتابِ نبوت کی کرنیں' احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ کی ضیا پاشیاں نئے انداز میں"

دینِ اسلام کی پوری عمارت دو مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہے قرآن مجید اور حدیث صحیح۔ اور جس طرح ہر دینی یا دنیوی قانون کے لئے توضیحات و تشریحات کی ضرورت ہے' قرآن مجید اور احادیث مقدسہ کی شرح و تفسیر کی بدرجہ اولیٰ ضرورت تھی؛ عربی، فارسی، اُردو اور دنیا کی دوسری زبانوں میں قرآن مجید کی سیکڑوں تفاسیر و تراجم لکھے گئے، اسی طرح کتب حدیث کی بھی عربی و فارسی وغیرہ زبانوں میں صدہا شروح تصنیف ہوئیں، مگر اُردو کا دامن حدیث کی کماحقہٗ اس خدمت سے خالی تھا۔ اسلام کا مکمل قانون دینی و دنیاوی زندگی میں قرآن مجید کی جہانتاب روشنی کے بعد حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی تنویر ہے جس میں مسائل فقہیہ کے علاوہ عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق، انسان کی دینی و دنیوی زندگی کے تمام مسائل غرض پورے اسلامی معاشرے کی مکمل و صحیح ترین تصویر سامنے آجاتی ہے۔ پھر فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند پایہ احادیث کو امام بخاری نے جس حسن و خوبی اور صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب فرمایا ہے اس کی نظیر اول و آخر میں نہیں ہے۔ اسلئے ہم نے خالص دینی و علمی نقطۂ نظر سے کتاب بخاری کی اُردو تشریح کا نیا باب کھولا ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ان تشریحات میں آپ کو حدیث رسولؐ کی اصل عظمت محسوس ہوگی، دَورِ حاضر کے تمام مسائل اور الجھنیں اس طرح حل نظر آئیں گی کہ حدیث زندگی کے تمام شعبوں میں کارفرما ہو۔ فقہیات کا تمام مجموعہ احادیث رسولؐ کا ایک عطر محسوس ہوگا۔ فرقِ باطلہ کیلئے یہ مجموعہ ایک صاعقۂ محرقہ ثابت ہوگا۔ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

ایک نسخۂ شفاء:۔ مصائب و مشکلات کے وقت تمام علماء اسلام نے بخاری شریف پڑھنے کا معمول رکھا ہے، اور یوں بھی پڑھئے تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے شرفِ ہم کلامی کی برکت حاصل ہو، سنیئے تو مبارک ارشادات کے انوار سے منور ہوجیے، گھر میں رکھئے تو خیر و برکت کا عظیم سرمایہ، دین و دنیا کی سب سے بڑی عزت و سعادت و قابلِ فخر دولت۔

چند دیگر خصوصیات

(۱) بخاری شریف کا پورا متن اعراب کیساتھ عربی خط میں، اور اُردو ترجمہ و تشریحات عمدہ نستعلیق خط میں ہوں گی۔

(۲) بخاری شریف کی قدیم شروح فتح الباری، عمدۃ القاری، ارشاد الساری، تیسیر القاری وغیرہ سے اہم مباحث وضاحت کے ساتھ درج ہوں گے

(۳) اپنے اکابر حضرت گنگوہیؒ، شیخ الہندؒ، حضرت مولانا مدنیؒ کی تقاریر درسِ ترمذی و بخاری کے افادات علمیہ شامل ہوں گے

(۴) محدث یگانہ علامۂ عصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی مطبوعہ تقاریر درسِ ترمذی و بخاری و ابوداؤد، ملفوظات عالیہ اور غیر مطبوعہ تقاریر درسِ بخاری شریف کے وہ مضامین عالیہ بھی درج کئے گئے ہیں جو مرتب موصوف نے بزمانۂ قیام جامعۂ ڈابھیل حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں رہ کر کئی سال تک قلمبند کئے تھے

(۵) اور علامہ عثمانیؒ کی فتح الملہم شرح مسلم کی گرانقدر علمی تحقیقات اور حدیثی تشریحات کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے

(۶) مختلف فیہ مسائل پر حنفیہ کی طرف کے دلائل و جواباتِ کا قابلِ قدر ذخیرہ پیش ہوگا جس میں حضرت شاہ صاحبؒ کے قلمی حواشی آثار السنن مسمّیٰ "الاتحاف" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

حضرتِ اقدس مجدد صاحبؒ اور دوسرے اکابرِ اُمت کے افاضات بھی موقع بموقع درج ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

لائحہ عمل اور ضروری باتیں

(۱) پوری کتاب کے تقریباً آٹھ ہزار صفحات ہوں گے، خریداروں کی سہولت کے خیال سے بالاقساط شائع کی جارہی ہے

(۲) یہ مجموعہ تقریباً چالیس حصوں میں شائع ہوگا، جس کے پہلے دو حصے ۵۰۴ صفحات کے بطور مقدمہ شائع کئے گئے ہیں۔ ان میں ۱۲ صدی کے سات سو محدثین کے گراں قدر علمی حالات و حدیثی خدمات مذکور ہیں۔ تیسرے حصہ سے بخاری شریف کی بے نظیر مبسوط و مکمل شرح اردو میں سہ ماہی پروگرام کے تحت اشاعت پذیر ہے، جو علماء، طلباء، جدید تعلیم یافتہ اور عام مسلمانوں کے لئے نہایت مفید ہے۔

(ھدیہ) مقدمہ کی ہر دو جلد آٹھ روپے آٹھ آنے۔ باقی ہر حصہ تین روپے آٹھ آنے۔ لیکن ممبرانِ ہند و پاک کے لئے (جو ایک روپیہ فیس ممبری آٹھویں حصہ کی اشاعت سے قبل جمع کردیں گے) ہر حصہ غیر مجلد ۲۰ تا ۳۰۰ دو سو صفحات کا ڈھائی روپے میں ہوگا (علاوہ محصول ڈاک)، جو حضرات مکمل کتاب غیر مجلد مع محصولڈاک و رجسٹری کے لئے ڈیڑھ سو روپے، مجلد کے لئے دو سو روپے جمع کریں گے۔ وہ اس عظیم حدیثی خدمت کے معاونین شمار ہوں گے۔

مکتبہ ناشر العلوم، بجارہ روڈ، بجنور (یو۔پی)

Marfat.com

49

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ

تفسیر ابن جریر (اردو)

تالیف

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ قرآن پاک

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح

اردو ترجمانی

ظہور الباری اعظمی

پارۂ اوّل ــــــ کا ــــــ جزء سوم

مکتبہ عثمانیہ 2280 ... وارالعلوم
... بخش کالونی کراچی 5

شائع کردہ:-

بیت الحکمت دیوبند (یوپی)

(قیمت ۲ روپے)

۲۹۶۲۱۴
ق۱۲۳۱
۱۳۳۹۷
No3

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
۱	شیطانی علم سے لگاؤ	۵
۲	سلیمان علیہ السلام کی برارت	۸
۳	بابل والوں کے نقشِ قدم پر	۱۱
۴	ہاروت و ماروت کے واقعہ کی حقیقت	۱۳
۵	واقعہ کی اسرائیلی تفصیلات	۱۴
۶	سحر کی حقیقت	۱۶
۷	فرشتوں کی طرف سے تنبیہ	۱۸
۸	کاش عقلِ سلیم سے کام لیتے	۲۰
۹	بارگاہِ رسالت کے آداب	۲۳
۱۰	خام خیالی	۲۵
۱۱	نسخِ آیات کا مسئلہ	۲۶
۱۲	تنبیہ	۳۳
۱۳	حسد کی کارفرمائی	۳۴
۱۴	عفو و درگذر کا حکم	۳۶
۱۵	مسلمانوں کو خصوصی حکم	۳۷
۱۶	بے بنیاد دعویٰ	۳۸
۱۷	صحیح قانونِ نجات	۳۹
۱۸	فتنہ انگیزی	۴۰
۱۹	سب سے بڑی محرومی	۴۲
۲۰	اللہ ہر جگہ ہے	۴۴
۲۱	عقیدۂ ابنیت کی تردید	۴۶
۲۲	بے سروپا مطالبے	۴۹
۲۳	آں حضورؐ کی ذمّہ داری	۵۰
۲۴	ہدایت اللہ کے بتائے ہوئے راستہ میں ہے	۵۱
۲۵	نصیحت و موعظت	۵۴
۲۶	ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش	۵۵
۲۷	خانہ کعبہ مرجع خلائق اور مقام امن	۵۹
۲۸	دعاءِ ابراہیمی	۶۳
۲۹	تعمیرِ کعبہ	۶۸
۳۰	انبیاء علیہم السلام کی وصیت	۷۷
۳۱	غلط دعوی نفع نہیں پہنچائیں گے	۷۹
۳۲	ابراہیم علیہ السلام کا دین	۸۰
۳۳	سیدھا اور بے خطر راستہ	۸۳
۳۴	معیار	۸۵
۳۵	اللہ تم سے زیادہ جانتا ہے۔	۸۷

Marfat.com

کمیونزم کے خد و خال نمایاں کرنے والی کتابیں

عثمان بطور

چین کے مجاہد عثمان بطور اور ان کے ساتھیوں کی ولولہ انگیز سرگذشت۔ جن کے بہادرانہ کارناموں نے اسلام کے دورِ اول کے مجاہدوں کی یاد تازہ کردی۔ ان مجاہدوں کی سرگذشت جنھوں نے اپنے مذہب اور معاشرے کو الحاد کی منظم یلغار سے بچانے کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیا

مترجم شاہد احمد دہلوی۔ ۳۵۲ صفحات

قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے

آج کا چین

مشہور ہندوستانی عالم ڈاکٹر ایس چندر شیکھر کا سفرنامہ۔ کمیونسٹ چین کی زندگی کے ہر پہلو کا سیر حاصل تجزیہ۔ مترجم مولانا محمد عثمان فارقلیط۔ ۲۴۰ صفحات۔

قیمت ایک روپیہ

سرگذشتِ امام

چین کے مشہور امام کاؤ ہاؤ جان کی آپ بیتی۔ جو اسلام کی خدمت کرنے کے بدلے سے چین گئے اور خدمت دین کی پاداش میں کمیونسٹ چین کے مظالم کا سامنا کیا۔ مترجم محمد صغیر صاحب مدیر روزنامہ "دعوت" دہلی ۱۰۴ صفحات۔

قیمت ۷۵ پیسے

چین کے مسلمان

یہ معلومات افزا کتابچہ چینی مسلمانوں کے تاریخی حالات اور ان کی موجودہ حالت پر روشنی ڈالتا ہے۔ پیش لفظ مولانا محمد عثمان فارقلیط ۶۴ صفحات۔

قیمت ۲۵ پیسے

پتھر کے دیوتا

دنیا کے چھ مشہور ادیبوں کی آپ بیتیاں۔ ان آپ بیتیوں میں انھوں نے ان اسباب پر روشنی ڈالی ہے جو کمیونزم پر ایمان لانے کے محرک بنے۔ اس کے بعد انھوں نے اس روحانی کرب کا ذکر کیا ہے جس نے ان کے ایمان میں رخنے ڈال دیئے۔ مترجم گوپال متل ۳۰۴ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔

آزادی کی طرف

ایک ممتاز روسی افسر وکٹر کراف شینکو کی انکشاف انگیز آپ بیتی۔ یہ کتاب جتنی انکشاف انگیز ہے اتنی ہی دلچسپ بھی ہے۔ ایک بار شروع کرکے اسے ختم کیے بغیر آپ ہاتھ سے نہیں رکھیں گے۔ مترجم ستیہ آنند شاکر ۴۸۶ صفحات

قیمت تین روپے

ظلمتِ نیمروز

ایک ایسے ملک کی لرزہ خیز کہانی جو آدرش وادی انقلابیوں کے ہاتھ میں پڑکر جنّت بنتے بنتے جہنّم بن گیا۔ روس کے ایک انقلابی رہنما کی رودادِ اسیری جس نے اپنی بے گناہی کے باوجود موت کی سزا پائی۔ اردو اقبالِ جرم کے بعد۔ مترجم گوپال متل ۲۹۶ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے

آزادی کا ادب

ہندو پاک کے تعمیر پسند شاعروں، افسانہ نگاروں اور ناقدوں کی منتخب تحریریں۔ مرتبہ گوپال متل۔ قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ:- **بیت الحکمت دیوبند**

Marfat.com

اُردو زبان میں دو عظیم الشان مذہبی اور علمی ذخیرے

قصص القرآن

قصص القرآن کا شمار نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور اُن کے دعوتِ حق اور پیغام کی تفصیلات پر اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی پوری کتاب چار ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے جس کے مجموعی صفحات ۱۷۸۴ ہیں

حصہ اوّل:۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات و واقعات قیمت آٹھ روپے

حصہ دوم:۔ حضرت یوشع علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰؑ تک تمام پیغمبروں کی مکمل سوانح حیات اور ان کی دعوتِ حق کی محققانہ تشریح و تفسیر قیمت چار روپے۔

حصہ سوم:۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ اصحاب الکہف والرقیم، اصحاب القریہ، اصحاب السبت، اصحاب الرس، بیت المقدس اور یہود، اصحاب الاخدود، اصحاب الفیل، اصحاب الجنۃ، ذوالقرنین اور سدِّ سکندری، سبا اور سیل عرم وغیرہ باقی قصص قرآنی کی مکمل و محققانہ تفسیر۔ قیمت پانچ روپے ۵۰ پیسے

حصہ چہارم:۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مکمل و مفصل حالات۔ قیمت آٹھ روپے۔ کامل سٹ قیمت غیر مجلد ۲۵/۵۰ مجلد ۲۹/۵۰

مکمل لغات القرآن (چھ جلدوں میں)

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لیے اُردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس عظیم الشان کتاب میں الفاظ قرآن کی مکمل اور دل پذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ بحثوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مدرس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا بہترین درس دے سکتا ہے اور ایک عام اُردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کر سکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اہل علم و تحقیق کے لیے اس کے علمی مباحث لائق مطالعہ ہیں "لغات القرآن" کے ساتھ الفاظ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے بڑی سہولت سے نکالے جا سکتے ہیں "مکمل لغات قرآن" اپنے انداز کی لاجواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی

جلد اوّل	صفحات	۳۳۴	بڑی تقطیع	غیر مجلد ۴/۵۰	مجلد	۵/۵۰
" دوم	"	۳۳۶	"	" ۵/۰	"	۶/۰
" سوم	"	۳۳۲	"	" ۵/۰	"	۶/۰
" چہارم	"	۳۸۶	"	" ۵/۰	"	۶/۰
" پنجم	"	۵۰۰	"	" ۶/۵۰	"	۷/۵۰
" ششم	"	۳۲۴	"	" ۴/۵۰	"	۵/۵۰

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۲)

ملنے کا پتہ:۔ **بیت الحکمت دیوبند**

Marfat.com

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ

اور انھوں نے ایسی چیز کا (یعنی سحر کا) اتباع کیا جس کا چرچا کیا کرتے تھے شیاطین (یعنی خبیث جن) حضرت سلیمان[1] کے (عہد) سلطنت میں۔ اور حضرت سلیمان نے کفر نہیں کیا

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى

مگر (ہاں) شیاطین (بے شک) کفر (و سحر) کرتے تھے اور حالت یہ تھی کہ آدمیوں کو بھی (اس) سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے اور اُس (سحر) کا بھی جو کہ ان دونوں

الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى

فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا شہر بابل میں (جن کا نام) ہاروت ماروت (تھا) اور وہ دونوں کسی کو یہ بتلاتے جب تک یہ (نہ)

يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ

کہہ دیتے کہ ہمارا وجود بھی ایک امتحان (خداوندی) ہے۔ سو تو کہیں کافر نہ بن جائیو (کہ اس میں پھنس جاتی) سو (بعضے) لوگ اُن دونوں سے اس قسم کا سحر

بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا

سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ سے (عمل کر کے) کسی مرد اور اس کی بیوی میں تفریق پیدا کرا دیتے تھے اور یہ (ساحر) لوگ اس کے ذریعہ سے کسی کو بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے مگر

بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا

خدا ہی کے (تقدیری) حکم سے اور ایسی چیزیں سیکھ لیتے ہیں جو (خود) اُن کو ضرر رساں ہیں اور ان کو نافع نہیں ہیں۔ اور ضرور یہ (یہودی) بھی اتنا جانتے ہیں

لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڵ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ

کہ جو شخص اس کو اختیار کرے ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ (باقی) نہیں اور بے شک بُری ہے وہ چیز (یعنی سحر و کفر) جس میں وہ لوگ

اَنْفُسَھُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ

اپنی جان دے رہے ہیں کاش ان کو (اتنی) عقل ہوتی اور اگر وہ لوگ (بجائے اس کے) ایمان اور تقویٰ (اختیار) کرتے تو خدا تعالیٰ کے ہاں کا

ع ۱۲ / ۱۲

مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (ع)

معاوضہ (اس کفر و بدعملی سے ہزار درجہ) بہتر ہے۔ کاش اُن کو (اتنی) عقل ہوتی

شیطانی علم سے لگاؤ

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیَاطِیْنُ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمَانَ "(اور یہ لوگ پیچھے لگ لیے اس علم کے جو سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت میں شیطان پڑھا کرتے تھے) اس سے مراد بھی احبار اور

[1] حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ ساڑھے نو سو سال قبل مسیح کا ہے۔ داؤد علیہ السلام کے صاحبزادے اور بنی اسرائیل کے نامور پیغمبروں میں آپ کا شمار ہے۔ آپ کی سلطنت کی شوکت و عظمت کے مخالف و موافق سب معترف ہیں (مترجم)

Marfat.com

علما یہود کی وہی جماعت ہے جس کا ذکر اوپر کی آیتوں سے ہوتا چلا آرہا ہے کہ انھوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اللہ کی اس کتاب سے تو اعراض کرتے ہیں جس کے متعلق انھیں خوب معلوم ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے اور اس کے بجائے اس جادو کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں جو سلیمان بن داؤد علیہما السلام کی سلطنت کے زمانہ میں شیطان پڑھا کرتے تھے۔ اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ طرزِ عمل باعثِ خسران اور کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں کہ آیت سے کون لوگ مراد ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودی ہیں یعنی وہ سحر (جادو) سے شغف اور اس میں انہماک رکھتے تھے اور اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ تورات، قرآن کے مطابق ہے اور قرآن ہی کی طرح اس میں بھی حضور اکرم ﷺ کی اتباع اور آپ کی تصدیق کا حکم موجود ہے۔ اس لیے انھوں نے اسے چھوڑ دیا اور ان کتابوں کے ذریعہ آں حضور ﷺ کی مخالفت شروع کی جیسے سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کے کاہنوں اور جادوگروں نے لکھا تھا۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ پہلے شیطان آسمان تک پہنچ جاتے تھے اور دنیا میں پیش آنے والے، موت یا دوسرے غیب کے واقعات فرشتوں سے کان لگا کر سنتے تھے (کیونکہ اللہ تعالیٰ کا جب کوئی حکم نازل ہوتا تو فرشتے اس کے متعلق آپس میں باتیں کرتے تھے) وہ اطلاعات شیطان کاہنوں سے آکر بیان کرتے تھے اور کاہن لوگوں سے بیان کر دیتے تھے۔ جب ان کے کہنے کے مطابق واقعہ پیش آجاتا اور کاہن مطمئن ہو جاتے کہ اب ہم پر لوگوں کو اطمینان ہو گیا ہے تو ستر جھوٹ اس میں اپنی طرف سے ملا کے بیان کرتے تھے۔ ان خرافات کو لوگ قلمبند کر لیتے تھے، اور اس کے ذریعہ بنی اسرائیل میں مشہور ہو گیا تھا کہ جنوں کو غیب کا علم حاصل ہے۔ سلیمان علیہ السلام کو جب صورتِ حال کا علم ہوا تو آپ نے اپنے آدمی بھیج کر لوگوں کی لکھی ہوئی جادو کی وہ کتابیں جمع کروائیں اور ایک صندوق میں بند کر کے اپنے تخت تلے اسے دفن کروا دیا۔ کوئی شیطان اگر آپ کے تخت کے پاس پہنچنے کی جرأت کرتا تو جل جاتا تھا۔ آپ نے یہ بھی اعلان کرا دیا کہ آج سے جس شخص کو یہ کہتے سنا جائے گا کہ شیطان علم غیب جانتے ہیں تو اسے قتل کروا دیا جائے گا۔ لیکن جب سلیمان علیہ السلام کی وفات ہو گئی اور وہ علما بھی انتقال کر گئے جو سلیمان علیہ السلام کے معاملات سے واقفیت رکھتے تھے تو شیطان انسانی صورت میں ان کے اخلاف کے پاس آیا اور کہا کہ میں تمھیں ایک ایسے خزانہ کا پتہ بتاؤں گا جسے تم کبھی کھا نہیں سکو گے۔ اور اس طرح سلیمان علیہ السلام کے تخت تلے کی جگہ کی نشاندہی کی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ تم بھی اس جگہ کے قریب آجاؤ۔ اس نے کہا کہ میں تخت کی جگہ کے قریب نہیں آسکتا، البتہ یہاں کھڑا ہوں، اگر تمھیں وہ خزانہ نہ ملے تو مجھے مار ڈالنا۔ جگہ کھودی گئی اور وہی جادو کی کتابیں نکلیں تو شیطان نے کہا کہ سلیمان علیہ السلام انسانوں، جنوں اور پرندوں کو اسی جادو کے ذریعہ اپنے تابع میں رکھتے تھے۔ یہ خبر بنی اسرائیل میں پھیل گئی اور مشہور ہو گیا کہ سلیمان علیہ السلام (نعوذ باللہ) جادوگر تھے۔ بنی اسرائیل کو یہ تمام کتابیں مل گئیں اور انھوں نے اس کے ساتھ بڑے انہماک اور شغف کا مظاہرہ کیا۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نبی بنا کر بھیجے گئے تو آپ کی مخالفت میں بھی انھوں نے انھیں کتابوں کو استعمال کیا۔ اسی کے متعلق قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ مدینہ کے بنی اسرائیل ایک زمانہ تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تورات کے مضامین کے متعلق سوالات کرتے رہے۔ جب وہ کوئی سوال کرتے تو اللہ تعالیٰ اس کے متعلق وحی نازل کرتا۔ وہ بہت زچ ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ شخص تو ہماری کتابوں کا ہم سے بھی زیادہ جاننے والا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے جادو کے متعلق سوال کیا اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

Marfat.com

اس روایت میں ہے کہ شیطانوں نے ہی خود سلیمان علیہ السلام کے تخت کے نیچے جادو کی کتابیں گاڑ دیں۔ چونکہ سلیمان علیہ السلام کو غیب کا علم حاصل
ن تھا اس لیے آپ غافل رہے۔ اور جب آپ کی وفات ہوگئی تو وہ کتابیں نکال کر لوگوں کو دکھلانے لگے کہ یہی وہ علم ہے جسے سلیمان نے
پا رکھا تھا اور اسی کے ذریعہ لوگوں پر حکومت کرتے تھے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس راز سے بھی پردہ فاش کر دیا تو وہ
ت رنجیدہ واپس لوٹ گئے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی کے مطابق روایت ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں دوسرا قول یہ ہے کہ مراد سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کے یہودی ہیں، یعنی آپ کے زمانہ کے یہودی جادو کے پیچھے لگ
ے تھے۔ ابن جریج سے یہی روایت ہے۔ ابن اسحاق سے اس تفسیر کی تائید میں منقول ہے کہ جب شیاطین کو سلیمان علیہ السلام کی وفات
یقین ہوگیا تو انھوں نے مختلف قسم کے جادو کتابی شکل میں جمع کر دیئے اور اس پر سلیمان علیہ السلام کی مہر لگا دی۔ اور یہ عبارت لکھ دی کہ

”یہ وہ نادر و نایاب علوم کے خزانے ہیں جنھیں شہنشاہ سلیمان بن داؤد کے وزیر آصف بن برخیا نے جمع کیا ہے“

پھر اسے آپ کے تخت کے نیچے دفن کر دیا، اور بنی اسرائیل کی آنے والی نسل نے جب اس کے متعلق سنا تو اسے نکال لیا۔
جب انھوں نے اسے دیکھا تو کہنے لگے کہ اب کوئی شبہ نہیں رہا کہ سلیمان بن داؤد اسی علم کے ذریعہ حکومت کرتے تھے۔ چنانچہ
انھوں نے تمام لوگوں میں جادو کو پھیلایا اور اسے سیکھنے سکھانے لگے۔ جادو کا چرچا اور اس پر اعتقاد و عمل جتنا یہودیوں میں تھا اور کسی قوم میں
نہیں تھا۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے بارے میں وحی نازل ہوئی، اور قرآن نے انھیں اللہ کے
برگزیدہ اور پاک انبیاء میں شمار کیا تو مدینہ کے یہودی کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہیں دیکھتے، سلیمان بن داؤد (علیہ السلام) کو بھی یہ نبی
کہتے ہیں، وہ تو ایک جادوگر تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ”مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ“ (جو شیطان پڑھا کرتے تھے) سے مراد لہو و لعب
اور ہر وہ چیز ہے جو اللہ کے ذکر سے روکتی ہو۔

لیکن آیت کی مناسب تفسیر یہی ہے کہ یہ ان احبار یہود کی توبیخ کے لیے نازل ہوئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں
موجود تھے اور جان بوجھ کر آپ ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے تھے۔ یعنی خود ان کی کتاب آسمانی توریت کے ذریعہ انھیں خوب اچھی طرح اس کا
علم ہے کہ آں حضور ﷺ اللہ کے رسول ہیں لیکن ان کا عمل اپنی آسمانی کتاب پر ہے ہی کہاں، وہ تو اپنے اسلاف کی طرح ان سفلی علوم کے
پیچھے لگے ہوئے ہیں جنھیں سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں شیطان پڑھتے تھے۔ آیت کی یہ تفسیر زیادہ مناسب اس لیے ہے کہ جادو وا
اس کے ساتھ انہماک و شغف یہودیوں میں سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کے بعد ہی سے ہمیشہ رہا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے
یہودیوں کا بھی یہی حال تھا۔ اور آیت میں ایسا کوئی لفظ موجود نہیں جس سے معلوم ہوتا ہو کہ بنی اسرائیل کے کسی خاص طبقہ کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ
اسے جادو وغیرہ علوم سفلیہ سے لگاؤ تھا۔ اس لیے تفسیر میں بھی آیت کا مفہوم عام لینا ہی صحیح ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی کئی مرتبہ اس کی تفصیل
کر چکے ہیں کہ اسلاف اور آباء و اجداد کے کاموں کی نسبت ان کے اخلاف و اولاد کی طرف کر کے بیان کرنے کا عرب میں عام دستور تھا، اس
لیے پہلے اگرچہ ان کے اسلاف شیطانی علوم کے پیچھے لگے تھے لیکن بعد میں بھی یہودیوں میں اس کا ہمیشہ رواج رہا ہے۔ آیت کی تفسیر کی تعیین
کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کوئی حدیث منقول نہیں ہے، اس لیے آیت کو عام رکھنا اور یہ کہنا کہ سلیمان علیہ السلام کے
زمانہ سے لے کر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کے یہودی مراد ہیں، زیادہ بہتر ہے۔ ”مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ“ میں ”ما“ ”اَلَّذِیْ“ کے معنی میں
ہے (یعنی جو) مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ اور یہ لوگ پیچھے لگے ہوئے ہیں اس علم کے جو سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں شیطان پڑھتے تھے۔
تَتْلُوْا (تلاوت سے) کا مفہوم بعض حضرات نے پڑھنا، تلاوت کرنا، بات کرنا، خبر دینا بیان کیا ہے جیسے ”تلاوت قرآن“
استعمال ہوتا ہے یعنی قرآن پڑھنا۔ اس معنی کی بنیاد پر آیت سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ شیطانوں ہی نے لوگوں کو جادو سکھایا اور ان تک

Marfat.com

جادو پہنچایا۔ مجاہد، قتادہ، عطاء اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے یہی تفسیر منقول ہے۔ ایک دوسری تفسیر یہ ہے کہ تَتْلُوْا کے معنیٰ پیروی کرنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت میں یہ معنیٰ بھی منقول ہیں اور ابو رزین رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہ روایت ہے۔ کلام عرب میں یہ لفظ دونوں ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، یعنی اتباع کرنے کے معنیٰ میں بھی اور قراءت کرنے اور پڑھنے کے معنیٰ میں بھی اور آیت میں بھی دونوں معنوں کا احتمال موجود ہے۔ "عَلٰی مُلْكِ سُلَيْمَانَ" میں لفظ "عَلٰی" فِیْ (بمعنیٰ میں) کے معنیٰ میں ہے۔ اہلِ عرب کلمہ "فِیْ" (بمعنیٰ میں) کو "عَلٰی" (بمعنیٰ پر) کی جگہ استعمال کرتے ہیں اور اس کے برعکس بھی استعمال کرتے ہیں۔ ابن جریج اور ابن اسحاق رحمہما اللہ سے آیت کی تفسیر اسی کے مطابق نقل ہوئی ہے کہ "عَلٰی مُلْكِ سُلَيْمَانَ" کا مطلب ہے کہ "سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت میں"۔

سلیمان علیہ السلام کی براءت

"وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ" (اور سلیمان نے کفر نہیں کیا، البتہ شیطان کفر کیا کرتے تھے، لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے) سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی طرف کفر کی نسبت کس نے کی تھی کہ قرآن مجید میں اس سے آپ کی براءت کی ضرورت پیش آئی۔

اس سے پہلے کی آیت میں صرف اتنا تذکرہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سلطنت میں بنی اسرائیل سحر و جادو کے پیچھے لگ گئے تھے۔ اس کا آپؑ کی طرف نسبتِ کفر سے کیا تعلق ہے؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جن بنی اسرائیل کے متعلق ارشاد ہے کہ وہ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں سحر و کفر کے پیچھے لگ گئے تھے، وہی لوگ اس شیطانی علم کو سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرنے لگے تھے اور کہتے تھے کہ ساری باتیں ان کے علم میں تھیں اور یہ سلسلہ انھیں سے چلا ہے، ان کا یہ بھی خیال ہو گیا تھا کہ سلیمان علیہ السلام کی انسانوں، جنوں، شیاطین اور اللہ کی بہت سی دوسری مخلوقات پر حکومت اسی سحر و جادو کا نتیجہ تھی۔ وہ کہنے لگے تھے کہ (نعوذ باللہ) سلیمان علیہ السلام اللہ کے نبی نہیں تھے، بلکہ وہ تو محض ایک جادوگر تھے اور ان کی ساری سلطنت اور شوکت و دبدبہ اسی جادو کا کرشمہ تھی۔ علماء بنی اسرائیل اس طرح اپنی قوم کے جاہل و ناخواندہ عوام کو، سحر کو ایک اچھا علم باور کرانے میں بھی کامیاب ہو گئے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اس علم کو حرام کیا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سحر اور کفر سے آپ کی براءت کی اور ارشاد فرمایا کہ "اور سلیمان نے کفر نہیں کیا"۔ پھر جو یہودی آپ کی طرف اس غلط اور بے بنیاد نسبت سے فائدہ اٹھاتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ سلیمان بن داؤد بھی جادوگر تھے، اس لیے ہمارے لیے بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں، تو اللہ تعالیٰ نے انھیں بھی جھٹلایا کہ سلیمان علیہ السلام ہرگز جادوگر نہیں تھے، یہ تو ایک شیطانی علم ہے جس کے پیچھے بنی اسرائیلی سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں لگ گئے تھے۔ سلیمان علیہ السلام نے کبھی اس کا حکم کسی کو نہیں دیا، بلکہ آپ تو اللہ کی طاعت اور اس کی کتاب کے احکام پر عمل کا لوگوں کو حکم دیتے تھے۔

سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ سلیمان علیہ السلام بڑی نگرانی رکھتے تھے اور جہاں شیاطین کے پاس کسی جادو کا علم ہوا اسے فوراً اپنے تخت کے نیچے دفن کروا دیا کرتے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں تک شیطان نہیں پہنچ سکتے تھے۔ لیکن شیطانوں نے انسانوں سے میل جول بڑھایا اور کہا کہ تمھیں معلوم بھی ہے کہ سلیمان کس طاقت کے ذریعہ شیاطین اور ہواؤں تک کو مسخر کیے ہوئے تھے؟ پھر انھیں شیطانوں نے آپ کے تخت کے نیچے آپ کے خزانے کی جگہ بتائی اور بنی اسرائیل اس پر عمل کرنے لگے۔ حجاز کے یہودی بھی یہی کہتے تھے کہ سلیمان علیہ السلام واقعی جادوگر تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کی براءت اور آپ کی تعریف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی نازل کی۔

Marfat.com

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ سلیمان علیہ السلام پر ساری تہمتیں ایک خاص معاملہ کی وجہ سے لگائی گئی تھیں، جس کا تعلق آپ کی ایک بیوی "جرادہ" کے رشتہ داروں سے تھا۔ حضرت جرادہ کی آپ کے یہاں تمام بیویوں میں سب سے زیادہ عزت تھی۔ اس معاملہ میں سلیمان علیہ السلام کا خیال یہ تھا کہ حق حضرت جرادہ کے رشتہ داروں کے ساتھ ہے، چنانچہ آپ نے انھیں کے حق میں فیصلہ کر دیا تھا۔ بیان کیا کہ سلیمان بن داؤد علیہما السلام جب بیت الخلاء جاتے یا اپنی کسی بیوی کے پاس تشریف لے جاتے تو حضرت جرادہ کو اپنی مہر دے جاتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو آزمانا چاہا تو ایک دن ایسا ہوا کہ جب آپ نے حضرت جرادہ کو اپنی مہر (جو انگوٹھی پر تھی) دی تو شیطان سلیمان علیہ السلام کی صورت میں ان کے پاس آیا اور ان سے کہنے لگا کہ میری مہر دے دو۔ حضرت جرادہ نے فرمایا تم جھوٹے ہو، تم سلیمان علیہ السلام نہیں ہو۔ اس واقعہ سے سلیمان علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ آزمائش ہے اور انھیں آزمایا جائے گا۔

اس کے بعد شیطانوں نے دور جا کر کچھ کتابیں لکھنی شروع کیں جن میں جادو اور کفر تھا اور ان کتابوں کو آپ کے تخت کے نیچے دفن کر دیا۔ پھر ان کتابوں کو نکال کر خود ہی لوگوں کو سنانے لگے اور کہنے لگے کہ سلیمان انھیں کتابوں کی مدد سے لوگوں پر حکومت کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے آپ کی طرف کفر کی نسبت شروع کر دی لیکن جب اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا تو آپ کے ذریعہ حقیقت حال صاف اور واضح کی کہ "کفر سلیمان علیہ السلام نے نہیں کیا تھا، بلکہ شیطان کفر کیا کرتے تھے"۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت میں منقول ہے کہ آپ ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ اتنے میں ایک شخص عراق سے آیا (حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وفات کے بعد) آپ نے اس سے پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو؟ اس نے بتایا کہ عراق سے آپ نے دریافت فرمایا، عراق کے کس شہر سے؟ اس نے بتایا کہ کوفہ سے۔ آپ نے وہاں کے حالات دریافت فرمائے تو اس نے بتایا کہ جب میں وہاں سے روانہ ہوا ہوں تو لوگوں میں اس کا چرچا تھا کہ علی کرم اللہ وجہہ دوبارہ تشریف لائیں گے۔ آپ نے فرمایا، تمہارا باپ مرے، اگر ہمارا بھی یہی خیال ہوتا تو ہم آپ کی بیویوں سے نکاح کبھی نہ کرتے اور نہ آپ کی میراث تقسیم کرتے۔ اسی سلسلے کا میں تمھیں ایک واقعہ سناؤں گا، پہلے شیاطین چھپے چوری آسمان کی خبریں سن لیا کرتے تھے اور پھر اس میں سو جھوٹ ملا کر لوگوں سے بیان کرتے تھے۔ ایک بات بھی صحیح نکل آتی تو لوگ بہت خوش ہوتے اور سمجھتے کہ بس ساری باتیں سچی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو اس سے آگاہ کر دیا اور آپ نے شیطانوں کے اس علم کو اپنے تخت کے نیچے دفن کر دیا۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد شیطانوں نے انسانوں کے ساتھ مل کر اسے نکلوایا اور پھر سب نے اسے لکھ لیا۔ اہل عراق جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کی ان تہمتوں سے براءت ہی کے لیے قرآن مجید میں مذکورہ بالا آیتیں نازل کی ہیں۔

اب تک اس سلسلے میں جو روایتیں بیان کی گئی ہیں انھیں کے مطابق قتادہ، مجاہد، شہر بن حوشب رحمہم اللہ سے بھی منقول ہے ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بتایا کہ سلیمان بن داؤد علیہما السلام بھی انبیاء میں سے تھے تو یہودیوں کے بعض علماء نے کہا کہ دیکھتے نہیں، محمد کہتے ہیں کہ سلیمان بن داؤد نبی تھے، خدا کی قسم، وہ تو جادوگر تھے۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں کچھ حذف و اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اصل میں عبارت یوں ہے کہ "اور یہ لوگ پیچھے لگ گئے اس علم کے جو سلیمان ع کی بادشاہت میں شیطان پڑھا کرتے تھے، اور سلیمان ع نے تو کبھی کفر نہیں کیا کہ سحر پر عمل کرتے، البتہ شیطان ہی کفر کیا کرتے تھے اور لوگوں کو سحر سکھایا کرتے تھے"۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح تفسیر منقول ہے "مَا تَتْلُوْا" میں "ما" "اَلَّذِیْ" (جو) کے معنی میں ہے اور اس سے مراد آیت

Marfat.com

ہیں سحر ہے۔ اب ایک سوال رہ جاتا ہے کہ کیا سحر سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ ہی میں وجود میں آیا ہے کہ اس خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ آپ سے پہلے بھی اس کا رواج تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے ساحروں کے متعلق خود خبر دی ہے جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ آپ کا زمانہ سلیمان علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔ اسی طرح نوح علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے کہ آپ کی قوم نے آپ کے متعلق کہا کہ "وہ تو جادوگر ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جادو اور سحر اس زمانہ میں بھی تھا لیکن آیت میں خصوصیت کے ساتھ یہودیوں کے متعلق یہ کہ "وہ اس علم کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جو سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت کے زمانہ میں شیطان پڑھا کرتے تھے"۔ اس لیے کہا گیا کہ انھوں نے خود جادوگری کا الزام سلیمان علیہ السلام پر لگایا تھا، جیسا کہ ہم نے تفصیل کے ساتھ اس سلسلے میں روایتیں بیان کی ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کی برارت کرنی چاہی اور اس راز سے پردہ اٹھایا کہ یہودیوں میں سحر و جادو کا رواج عام کس طرح ہوا

---

(۵) سحر (یا جادو) نام ہے اسبابِ خفی (مثلاً تاثیر کواکب، استعانت شیاطین وغیرہ) سے کام لے کر عجیب و غریب تصرفات کرنے کا۔ خاص خاص مشقتوں اور ریاضتوں سے یہ فن حاصل ہو جاتا ہے۔ مشرک اور جاہل قوموں میں یہ رواج پہلے بھی تھا، اب بھی ہے۔ شریعتِ اسلام نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ سحر و کہانت تاریخ بنی اسرائیل کا ایک مسلمہ اور ناقابلِ انکار جزء ہے۔ خود عہدِ عتیق کے صحیفوں میں اس کی شہادت موجود ہے۔ ایک موقعہ پر لکھا ہے "انھوں نے اپنے بیٹے بیٹی کو آگ کے درمیان گذارا اور فال گیری اور جادوگری کی۔ ان باتوں سے خداوند اسرائیل پر نہایت غصہ ہوا اور اپنی نظر سے انھیں گرا کر دور کر دیا" (۲ سلاطین)۔ یہود کا یہ شوق ان کی قدیم تاریخ سے قطع نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی قائم تھا۔ آکسفرڈ یونیورسٹی کا یہودی النسل و یہودی خصلت پروفیسر مارگولیس آنجہانی، جس کی اسلام دشمنی ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہوئی ہے، اپنی انگریزی سیرتِ رسول میں معاصر یہودِ عرب کے سلسلے میں لکھتا ہے:-

"یہ لوگ فنِ سحر کے ماہر تھے اور بجائے میدانِ جنگ میں آنے کے سفلی عملیات کو ترجیح دیتے تھے"۔

یہودیوں کی (اور یہی حال عیسائیوں کا بھی ہے) ستم ظریفی کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف تو سلیمان علیہ السلام کی عظمت و پیغمبری کے قائل ہیں اور دوسری طرف ان کے نامۂ اعمال میں گندے سے گندے جرائم بھی ڈال دیتے ہیں! یہاں تک کہ کفر و شرک بھی!۔ خاص الخاص بائبل یعنی عہدِ عتیق کے صحائف، جن پر یہود و نصاریٰ دونوں کا ایمان ہے، اس کی تصریحات یہ ہیں:- "جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا، اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا" (۱۔ سلاطین)۔ ایک موقعہ پر ہے "سو خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا کی طرف سے برگشتہ ہوا، اس لیے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے پر اس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا (۱۔ سلاطین)۔ معاذ اللہ، خدا کا پیغمبر اور کفر و شرک میں مبتلا چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔ دنیا ہزار ڈیڑھ ہزار سال تک انھیں یہودیانہ تحریفات و اختراعات کا شکار ہو کر اس موحدِ اعظم کو نعوذ باللہ کافر و مشرک سمجھتی رہی۔ یہاں تک کہ قرآن آیا، جو ہر قوم، ہر زمانہ کے سچے پیغمبروں کی عزت و ناموس کا محافظ ہے، اور اس نے آ کر یقین نہ کرنے والی دنیا کے سامنے اعلان کیا کہ سلیمان کو معاذ اللہ کافر کہتے ہو، وہ تو کفر کے قریب تک نہیں گئے تھے۔ قرآن کی صدائے حق فضا میں بلند ہو کر خاموش ہو گئی۔ جن کے کان تھے انھوں نے سنا، دنیا اپنے کاروبار میں لگی رہی، بائبل والوں نے بائبل کی پرستاری نہ چھوڑی۔ اس طرح ساڑھے تیرہ صدیاں گذر گئیں۔ اور اب قدرتِ حق کا اعجاز دیکھیے کہ اب جو محققانہ اور فاضلانہ کتابیں خود بائبل کے پرستاروں کے قلم سے نکل رہی ہیں اور شائع ہو رہی ہیں، وہ تائید و تصدیق بائبل کی الزام دہی کی نہیں، بلکہ قرآن کے جواب صفائی کی کر رہی ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا برطانوی کاوش و تحقیق کا لبِ لباب ہوتا ہے، باقی حاشیہ صفحہ ۱۱ پر

Marfat.com

بابل والوں کے نقش قدم پر

"وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ" (اور وہ پیچھے لگ گئے) اس علم کے بھی جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اتارا گیا تھا) آیت میں لفظ "ما" کے مفہوم کی تعیین کے سلسلے میں ائمہ تفسیر سے مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "ما" انکار کے لیے "لا" (یعنی نہیں) کے معنی میں ہے، آپ نے فرمایا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے بابل کے دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر جادو نہیں اتارا تھا"۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ اس توجیہ کی بنیاد پر مفہوم اس طرح ہو گا کہ "یہ پیچھے لگ گئے اس جادو کے جو سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے، اور سلیمان ع نے کفر نہیں کیا اور نہ اللہ نے جادو دو فرشتوں پر اتارا، بلکہ شیاطین نے کفر کیا، وہ لوگوں (خاص طور سے ہاروت و ماروت) کو بابل میں جادو سکھایا کرتے تھے"۔ اس تفسیر میں "بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ" "تاخیر ما حقہ التقدیم" کے قاعدہ کے ذیل میں ہے یعنی اگرچہ ان کا ذکر آیت میں بعد میں ہوا ہے لیکن معنی اور مفہوم کے اعتبار سے ان کا تعلق اس سے پہلے کے جملہ "يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ" سے ہے۔ اصل میں یہودیوں کے جادوگر کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جادو جبرئیل و میکائیل علیہما السلام کے ذریعہ سلیمان بن داؤد پر نازل کیا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید کی اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی اعلان کروایا کہ جبرئیل و میکائیل علیہما السلام نعوذ باللہ کبھی جادو لیکر نہیں نازل ہوئے اور یہودی جو الزام سلیمان علیہ السلام پر لگاتے تھے اس سے آپ کی برات کی اور بتایا کہ جادو تو شیطان کا کام ہے اور وہی بابل (موجودہ عراق) میں لوگوں کو یہ علم سکھاتے تھے، خاص طور سے ہاروت و ماروت دو انسان تھے جنہیں وہ اس کی تعلیم دیتے تھے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ "ما" "اَلَّذِيْ" (جو) کے معنی میں ہے۔ عبد اللہ رضی اللہ عنہ، سدی، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ سے یہی منقول ہے۔ اس معنی کی بنا پر آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ "یہودی اس کے پیچھے لگے جو سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت کے زمانہ میں شیطان پڑھا کرتے تھے اور اس کے پیچھے لگے جو بابل میں ہاروت و ماروت نامی دو فرشتوں پر اتارا گیا تھا"۔

اس تفسیر میں ہاروت و ماروت کو اللہ کا فرشتہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مفصل بحث ہم آگے کریں گے۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ جائز ہے کہ جادو اللہ تعالیٰ نازل کرے؟ اور کیا یہ جائز ہے کہ اللہ کے فرشتے لوگوں کو جادو سکھائیں؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خیر و شر، بھلائی اور برائی سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی سب کا حکم بھی صاف صاف نازل کر دیا ہے اور اپنے انبیاء کے ذریعہ ہمیں بتا دیا ہے کہ کون سی چیزیں ہمارے لیے جائز ہیں اور کون سی ناجائز ہیں۔ زنا، چوری، اور دنیا بھر کے گناہ ہمارے لیے جانے پہچانے ہیں، البتہ ہمیں ان کے کرنے سے روکا گیا ہے۔ اسی لیے ان علماء نے کہا ہے کہ جادو کا علم حاصل کرنا گناہ نہیں[1] ہے، اس پر عمل کرنا گناہ ہے جیسے شراب کشید کرنے کا علم، بت گری یا دوسرے لہو و لعب کی صنعتوں کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱) اس کے سب سے آخری ایڈیشن میں مقالہ زیر عنوان "سلیمان" نکال کر دیکھیے، صاف یہ مضمون ملے گا کہ سلیمان خدائے واحد کے مخلص پرستار تھے" (جلد ۲ صفحہ ۹۵۲)۔ انسائیکلوپیڈیا ببلیکا، خاص مسیحی فضلا اور پرستاران بائبل کی تحقیقات کا ثمرہ ہے، اس میں تو بائبل کی ان عبارتوں کا حوالہ دے کر جو اوپر نقل کی گئی ہیں، یہاں تک لکھا ہے کہ یہ عبارتیں بعد کو بڑھائی گئی ہیں اور الحاقی ہیں۔ پھر لکھا ہے کہ "یہ تو غالباً صحیح ہے کہ سلیمان کی بیویاں متعدد تھیں، اسرائیلی بھی اور غیر اسرائیلی بھی، لیکن انہوں نے نہ تو سب کے لیے قربان گاہیں تیار کرائیں اور نہ خود خدائے واحد کی پرستش کے ساتھ اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش کا تجربہ ہونے دیا" (کالم ۴۶۸۹)۔ (تفسیر ماجدی)۔

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ہذا)[1] چونکہ جادو سیکھنے کے بعد جادوگر اسے کرتا بھی ضرور ہے اس لیے علماء نے احتیاطاً جادو سیکھنا بھی ناجائز لکھا ہے (باقی بر صفحہ ۱۴)

Marfat.com

علم گناہ نہیں ہے، البتہ اسے عمل میں لانا اور اس علم کے مطابق بنانا گناہ ہے۔ اسی طرح جادو کا علم حاصل کرنا گناہ نہیں ہے
اس کے ذریعہ کسی کو کوئی نقصان پہنچانا حرام ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں پر جادو اتارا اور انھوں نے لوگوں کو یہ علم
سکھایا تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے، کیونکہ وہ اللہ کے حکم سے لوگوں کو یہ علم سکھاتے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ "ہم تو بس ایک ذریعہ
امتحان ہیں"۔ یعنی ساتھ ہی ساتھ وہ فرشتے لوگوں کو جادو کرنے اور کفر کرنے سے روکتے بھی تھے۔ البتہ اگر کوئی شخص ان فرشتوں سے وہ علم
سیکھ کر اس پر عمل کرتا تو یہ گناہ تھا۔ اس پر عمل کرنا اور

تیسری تفسیر یہ ہے کہ "ما" اَلَّذِی (بمعنی جو) کے معنی میں ہے، اور اس کا عطف "مَاتَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ" کے "ما" پر
ہے، دونوں "ما" میں فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے "ما" (بمعنی جو) سے "جادو" مراد ہے اور دوسرے "ما" (بمعنی جو) سے
میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے والا علم مراد ہے۔ اس تفسیر کی بنیاد پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "یہودی پیچھے لگ گئے اس
جادو کے علم کے جسے سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت کے زمانہ میں شیاطین پڑھا کرتے تھے اور وہ پیچھے لگ گئے میاں اور
بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کے علم کے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر نازل ہوا تھا"۔ یہ تفسیر مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے
روایت ہے، آپ نے فرمایا کہ شیطان جادو سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں سکھاتے تھے، اور بابل میں دو فرشتے صرف میاں بیوی کے
درمیان جدائی ڈالنے کا طریقہ سکھاتے تھے۔

چوتھی تفسیر قاسم بن محمد سے روایت ہے کہ "ما" اَلَّذِی (بمعنی جو) اور لَمْ (بمعنی نفی) دونوں معنی میں مراد لیا جاسکتا ہے
آپ نے فرمایا کہ دونوں میں سے جو بھی مراد لیا جائے صحیح ہے۔

میرے نزدیک صحیح تفسیر یہ ہے کہ "ما" اَلَّذِی (جو) کے معنی میں لیا جائے۔ اگر ہم "ما" کو نفی اور انکار کے معنی میں
مراد لیں تو اس سے سرے سے اس کی نفی ہو جاتی ہے کہ بابل میں دو فرشتے بھی نازل ہوئے تھے۔ پھر جو دو اسم "مَلَکَیْنِ" (دو
فرشتے) کے بعد ذکر ہوئے ہیں یعنی "ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ" یا یہ دونوں اسم "مَلَکَیْنِ" سے بدل اور اس کی تشریح بن سکتے
ہیں، یا اس کے بجائے یہ "اَلنَّاسَ" (لوگوں) سے بدل اور تشریح بنیں گے جو اس سے قبل "یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ" میں
مذکور ہے۔ اگر انھیں "مَلَکَیْنِ" سے بدل بنایا جائے اور اس کی تشریح قرار دی جائے تو پھر اس کے بعد مذکورہ آیت "اور وہ
دونوں کسی کو بھی نہیں بتاتے تھے، جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو بس ایک ذریعہ آزمائش ہیں، سو تم کہیں کفر نہ اختیار کر لینا،
مگر لوگ ان دونوں سے وہ سیکھ ہی لیتے تھے جس سے وہ جدائی ڈال دیتے درمیان مرد اور اس کی بیوی کے" کا کوئی مفہوم ہی باقی
نہیں رہتا، کیونکہ جب وہ دونوں فرشتے خود اس علم کے جاننے والے نہیں تھے جس کے ذریعہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱) اس کے علاوہ جادو کے علم میں اکثر کلماتِ کفریہ استعمال ہوتے ہیں اس لیے بھی۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جادو کی مختلف صورتوں کی تحقیق اس طرح لکھی ہے کہ اگر اس میں کلماتِ کفریہ ہوں، مثلاً استعانت
شیاطین و کواکب وغیرہ، تب تو کفر ہے، خواہ اس سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے خواہ نفع۔ اور اگر کلماتِ مباحہ ہوں تو اگر کسی کو خلاف اذنِ شرعی
کسی قسم کا ضرر پہنچایا جائے یا کسی اور غرض ناجائز میں استعمال کیا جائے تو وہ فسق و معصیت ہے، اور اگر ضرر نہ پہنچایا جائے نہ کسی اور غرضِ
ناجائز میں استعمال کیا جائے تو اسے عرف میں سحر نہیں کہتے، بلکہ عمل یا عزیمت یا تعویذ گنڈہ کہتے ہیں اور وہ مباح ہے۔ اور اگر کلمات مفہوم نہ ہوں تو
بوجہ احتمالِ کفر ہونے کے واجب الاحتراز ہے۔ اور کفر عملی کا اطلاق ہر ناجائز پر صحیح ہے"۔

Marfat.com

ڈال سکتے ہیں تو آخر ان سے وہ کیا چیز لوگ سیکھتے تھے جس کا ذکر اس آیت میں ہے کہ "جس سے وہ جدائی ڈالتے درمیان مرد اور اس کی بیوی کے"۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان آیات سے کوئی مطلب مفہوم ہی نہیں ہوتا۔ دوسری صورت اس تفسیر میں یہ ہوسکتی تھی کہ "ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ" کو "لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ" (البتہ شیطان ہی کفر کیا کرتے تھے، لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے) میں "اَلنَّاسَ" (لوگوں) کی تشریح اور اس کا بدل مانا جائے۔ اس صورت میں لازم آئے گا کہ شیاطین ہی نے ہاروت و ماروت کو جادو سکھایا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہاروت و ماروت فرشتے نہیں ہوسکتے، کیونکہ شیطانی علم سیکھ کر لوگوں کو اس کی تعلیم دینا کفر اور بہت بڑی معصیت ہے، اور ہاروت و ماروت کے متعلق آگے کی آیت میں کہا گیا ہے کہ وہ دونوں اس فن کی باتیں بتانے سے پہلے کہہ دیتے تھے کہ ہم ذریعہ آزمائش ہیں، سو تم کہیں کفر نہ اختیار کر لینا"۔ اب انھیں اگر انسان کہا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ان کے ہلاک ہونے کے ساتھ ہی جادو اور اس پر عمل وغیرہ بھی ختم ہوگیا ہو۔ کیونکہ انھیں کے ذریعہ یہ علم سیکھا جاتا تھا، جب وہ ہلاک ہوگئے ہوں گے تو پھر اسے سیکھنے اور اس پر عمل کرنے کی بھی کوئی صورت نہیں رہی ہوگی کیونکہ ان کے بغیر اس علم کو سیکھنے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ حالانکہ جادو کا علم اور اس پر عمل ہر زمانے میں رہا ہے۔ اس لیئے یہ بات بھی چلنے والی نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت میں "ما" کو "اَلَّذِیْ" (جو) کے معنی میں مراد لینا ہی صحیح ہے۔

ہاروت و ماروت کے واقعہ کی حقیقت

البتہ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ فرشتوں کے لیئے یہ جائز کس طرح ہوگا کہ وہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کا علم لوگوں کو سکھائیں؟ اور پھر اللہ تعالیٰ خود کس طرح فرشتوں کو زمین پر اس کام کے لیئے اتار سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دنیا امتحان و آزمائش کی جگہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام بندوں کو پوری وضاحت کے ساتھ بتا دیا ہے کہ دنیا کی کیا چیزیں حلال ہیں اور کیا حرام ہیں، ظاہر ہے کہ جن چیزوں سے بھی اللہ تعالیٰ نے ہمیں روکا ہے اور جن چیزوں کا بھی حکم دیا ہے ان سب کا علم بھی دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر امر و نہی (حکم و منع) کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ جادو بھی انھیں چیزوں میں سے ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں منع کیا ہے۔ اس لیئے اگر اس نے دو فرشتوں کو سکھایا ہو اور پھر انھیں زمین پر اتار کر اپنے بندوں کے لیئے ذریعہ آزمائش بنایا ہو تو کوئی نئی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد کی آیت میں خود ہی ارشاد فرمایا ہے کہ جو کوئی ان دو فرشتوں یعنی ہاروت و ماروت سے یہ علم سیکھنے آتا تو سکھانے سے پہلے وہ اس سے کہہ دیتے کہ "ہم تو محض ذریعہ آزمائش ہیں، سو تم کہیں کفر نہ اختیار کر لینا"۔ ان دونوں فرشتوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی آزمائش مقصود تھی جنھیں اس نے پہلے ہی سے مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کی ترکیبوں کے استعمال سے اور جادو سے منع کر رکھا تھا۔ اس آزمائش کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے ان مومن بندوں کو گناہوں سے پاک کرنا چاہتا تھا جو ان دو فرشتوں سے اس فن کو سیکھنے سے رک جاتے اور جو منکر اور کافر ان سے جادو اور کفر کی تعلیم حاصل کرتے انھیں ذلیل کرنا تھا۔ دونوں فرشتوں کا جہاں تک تعلق ہے تو آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ان سے یہ فن سیکھنا چاہتا اسے سکھاتے وقت وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری سے سر مو تجاوز نہیں کرتے تھے۔ اللہ کے سوا بہت سے اللہ کے ولیوں اور نبیوں کی بھی لوگوں نے صحیح راستہ سے ہٹ کر عبادت کی ہے لیکن ظاہر ہے کہ لوگوں کے اس عمل سے اللہ کے ان اولیاء کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ جہاں تک ان سے ہوسکا وہ اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کرتے رہے۔ اب اگر کوئی اللہ کے سوا ان کی عبادت کرے تو وہ خود اس سے لوگوں کو منع کرتے تھے۔

Marfat.com

اس لیے انھیں دوسروں کے اس عمل سے کیوں نقصان پہنچے گا؟ یہی حال ان دو فرشتوں کا بھی ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق انھوں نے لوگوں کو جادو کا علم بتایا اور بتانے سے پہلے تاکید بھی کردی کہ ہم تو محض ذریعہ آزمائش ہیں، تم کفر ہرگز نہ کرنا۔ اس کے باوجود اگر کوئی ان سے سیکھتا ہے اور سحر و کفر کرتا ہے تو اس کی ذمہ داری ان دونوں فرشتوں پر نہیں آسکتی۔

واقعہ کی اسرائیلی تفصیلات

ہاروت و ماروت کے سلسلے میں بہت سی روایتیں منقول ہیں۔ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب انسانوں کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا اور نافرمانی اور گناہ بھی بڑھ گئے تو تمام فرشتے جو زمین، آسمان اور پہاڑوں پر متعین تھے دُعا کرنے لگے کہ اے اللہ! آپ انھیں ہلاک و برباد کیوں نہیں کردیتے، یہ لوگ آپ ہی کی مخلوق ہو کر آپ کی اس درجہ نافرمانی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر فرشتوں سے وحی کے ذریعہ کہا کہ اگر میں تمہارے ساتھ بھی شہوت اور شیطان کو کردیتا اور تم بھی دنیا میں اسی طرح ہوتے تو تم بھی گناہ اور نافرمانی کرتے۔ لیکن ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر انھیں آزمایا جائے تو وہ پاک اور ثابت قدم ثابت ہوں گے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی بھیجی کہ اپنے میں سے دو ایسے فرشتے منتخب کرلیں جو سب میں افضل و بہتر ہوں۔ انھوں نے دو فرشتے ہاروت و ماروت نامی کا انتخاب کیا اور انھیں زمین پر اتار دیا گیا اس کے بعد زہرہ کو اہل فارس میں ایک عورت کی صورت میں اتارا گیا۔ فارس والوں نے زہرہ کا نام "بیدخت" رکھا تھا۔ بیان کیا کہ پھر وہ دونوں فرشتے اس عورت سے بدکاری میں مبتلا ہو گئے۔ فرشتے ایمان لانے والوں کے لیے برابر مغفرت کی دُعا کرتے رہتے ہیں کہ "اے ہمارے رب! آپ کی رحمت اور علم ہر چیز پر پھیلا ہوا ہے، پس آپ ان کی مغفرت کیجیے جنھوں نے توبہ کرلی ہے"۔

چنانچہ جب دونوں فرشتے گناہ میں مبتلا ہو گئے تو فرشتوں نے اللہ کی مغفرت اور رحمت کا واسطہ دے کر دعا کی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا اور آخرت کے عذاب کے درمیان اختیار دے دیا کہ ان میں سے جسے وہ چاہیں اپنے لیے پسند کرلیں۔ انھوں نے دنیا کا عذاب پسند کیا۔ کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کی روایتیں منقول ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ایک روایت میں ہے کہ "زہرہ" فارس میں ایک خوب صورت عورت تھی اور اس نے ہاروت و ماروت دو فرشتوں سے اپنا فیصلہ کرانا چاہا تو انھوں نے اسے بُرے ارادہ سے اپنی طرف بلایا۔ اس نے اس شرط کے ساتھ ان کی دعوت منظور کی کہ وہ اسے وہ کلام سکھا دیں جسے اگر کوئی پڑھ لے تو آسمان پر پہنچ جائے۔ انھوں نے اسے سکھا دیا اور اس نے جوں ہی وہ کلام پڑھا فوراً آسمان پر پہنچ گئی اور مسخ کر کے ایک ستارہ بنادی گئی[۵۱]۔

سدی سے روایت ہے کہ ہاروت و ماروت دو فرشتوں نے انسانوں پر طنز کیا کہ وہ اللہ کے احکام کی تعمیل بھی نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ

---

[۵۱] یہ اسرائیلی روایات ہیں اور کسی درجہ میں بھی قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ ان قصوں کا بنی اسرائیل کی کتابوں میں ذکر تھا اور عام طور سے قصّے کہانی کے طور پر بھی کہے جاتے تھے۔ چوں کہ قرآن مجید میں بھی ہاروت و ماروت اور ان کے جادو کا ذکر ہے اس لیے مفسرین نے ان کی روایتوں کو بھی تفصیل سے بیان کردیا ہے۔ قدیم تفسیروں میں اسرائیلیات کا بہت بڑا عنصر پایا جاتا ہے اور ابن جریر تو ان قدیم تفسیروں سے بھی قدیم ہے۔ ظاہر ہے کہ مفسرین کے نزدیک یہ روایتیں خود نا قابلِ اعتبار رہی ہیں۔ شہاب الدین عراقی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ ہاروت و ماروت فرشتے تھے اور زہرہ کی وجہ سے ان پر عذاب ہوا تو وہ کافر ہے۔ دوسری تفصیلی روایتیں اس کے بعد بھی ذکر ہوئی ہیں اور وہ سب گھڑی ہوئی اور اسرائیلی لغویات ہیں بس حقیقت صرف اتنی ہے کہ جب بابل والوں میں سحر و جادو حد سے زیادہ بڑھ گیا تو اللہ تعالیٰ نے حق و باطل میں امتیاز کرنے کے لیے دو فرشتوں کو انسانی صورت میں اتارا۔ (مترجم)

Marfat.com

نے ان سے فرمایا کہ میں نے بنی آدم کو خواہشاتِ نفسانی کا کل دسواں حصہ دیا ہے اور اسی سے وہ میری نافرمانی کرتے رہتے ہیں۔ اس پر ہاروت وماروت نے کہا کہ اے ہمارے رب! اگر آپ ہمیں اتنی خواہشِ نفسانی دے دیں اور پھر ہم زمین پر پہنچ جائیں تو ہم عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پھر زمین پر جاؤ، میں نے تمھیں بھی اتنی ہی خواہشات نفسانی دے دی اور وہاں لوگوں میں فیصلہ کرو۔ چنانچہ دونوں فرشتے بابل (عراق) میں اترے۔ دونوں فرشتے وہاں فیصلہ کیا کرتے تھے اور معمول یہ تھا کہ جب شام ہوتی تو اوپر آسمان پر چلے جاتے اور صبح ہوتی تو پھر زمین پر فیصلہ کے لیئے اترتے۔

ایک مرتبہ ایک عورت اپنا مقدمہ لے کر آئی، اس کا اس کے شوہر سے جھگڑا تھا۔ دونوں فرشتوں کو اس کا حسن وجمال بہت پسند آیا۔ عربی میں اس عورت کا نام "زہرہ" ہے، لیکن نبطی میں اسے "بیدخت" کہتے تھے اور فارسی میں "اناہید"۔ ایک فرشتہ نے اپنے ساتھی سے کہا، اس عورت نے میرا دل موہ لیا ہے۔ دوسرے فرشتے نے کہا کہ میں بھی تم سے یہی بات کہنے والا تھا، لیکن شرم کی وجہ سے نہ کہہ سکا۔ دوسرے ساتھی نے کہا، کہو تو میں اس سے دل کی بات کہہ دوں۔ پہلے فرشتے نے کہا، کہہ دو، لیکن اللہ کے عذاب کا کیا ہوگا؟ دوسرے نے کہا کہ اللہ کی رحمت کی ہمیں امید ہے۔ پھر جب وہ عورت اپنے شوہر کے جھگڑے کا مقدمہ لے کر آئی تو انھوں نے اسے اپنی طرف بلایا۔ اس نے کہا، اس شرط پر مجھے منظور ہے کہ تم اس مقدمہ میں میرے شوہر کے خلاف فیصلہ کردو۔ انھوں نے ایسا ہی کردیا۔ اس کے بعد عورت نے دونوں فرشتوں سے ایک ویرانہ میں ملاقات کا وعدہ کیا۔ دونوں فرشتے وہاں پہنچے۔ جب ایک نے اس سے برائی کرنی چاہی تو اس نے کہا کہ جب تک تم مجھے یہ نہیں بتا دوگے کہ تم کس کلام کو پڑھ کر آسمان پر پہنچ جاتے ہو اور کیا پڑھ کر زمین پر اتر آتے ہو، میں تمہاری خواہش نہیں پوری کرسکتی۔ دونوں فرشتوں نے وہ کلام اسے بتا دیا۔ اس نے جوں ہی ان کلمات کو اپنی زبان سے ادا کیا فوراً آسمان پر پہنچ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے وہ کلمات اس کے ذہن سے بھلا دیئے جنھیں پڑھ کر وہ زمین پر آسکتی، اس لیئے وہ وہیں رہ گئی اور اسے اللہ نے ایک ستارہ بنا دیا۔ رات ہوئی تو ہاروت وماروت نے بھی اوپر جانا چاہا، لیکن انھیں اس پر قدرت نہ ہوسکی۔ اب انھیں تنبہ ہوا کہ ان کی ہلاکت کا وقت قریب آگیا ہے۔ پھر انھیں دنیا اور آخرت کے عذاب کے درمیان اختیار دیا گیا کہ ان میں جسے چاہیں اپنے لیئے پسند کریں۔ انھوں نے آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں عذابِ دنیا کو پسند کیا۔ چنانچہ انھیں بابل میں لٹکا دیا گیا اور اس کے بعد وہ لوگوں کو اپنا مخصوص کلام بتانے لگے جو جادو تھا۔

ربیع سے روایت ہے کہ جب انسانوں میں کفر ومعصیت بہت بڑھ گئی تو فرشتوں نے کہا، اے رب العزت! آپ نے اس دنیا کو اپنی عبادت وطاعت کے لیئے پیدا کیا ہے، لیکن وہ تو اس کے بجائے کفر، قتل، حرام خوری، زنا اور شراب جیسی برائیوں میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ حقیقت ان کے لیئے غیب ہے اور وہ اسے دیکھتے نہیں، اس لیئے ایسا کرتے ہیں، لیکن انھوں نے اس پر بھی اپنی تنقید جاری رکھی، تو ان سے کہا گیا کہ تم اپنے میں سے دو فرشتے منتخب کرلو۔ انھوں نے ہاروت وماروت کا انتخاب کیا اور یہ دونوں فرشتے زمین پر اتر آئے۔ ان کے اندر بھی انسانوں جیسی نفسانی خواہشات پیدا کردی گئیں اور انھیں حکم ہوا کہ اللہ کی عبادت کریں اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، انھیں ناحق قتل، حرام مال کھانے، چوری، زنا اور شراب سب سے منع کردیا گیا۔ وہ ایک زمانہ تک روئے زمین پر رہے اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرتے رہے۔ یہ واقعہ ادریس علیہ السلام کے زمانہ کا ہے۔ اسی زمانہ میں ایک عورت تھی جو اپنے حسن وجمال میں تمام انسانوں پر فائق تھی جس طرح زہرہ ستارہ تمام ستاروں میں حسن وجمال کے اعتبار سے بڑھا ہوا ہے۔ یہ عورت ان دونوں فرشتوں کے پاس آئی تو انھوں نے اس سے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کیں اور اسے

Marfat.com

اپنے لیے چاہا لیکن عورت نے جواب دیا کہ جب تک تم میرا دین نہ اختیار کرلوگے میں تمہاری بات نہ مانوں گی۔ فرشتوں نے اس کے دین
کے متعلق پوچھا تو اس نے ایک بت نکال کر انھیں دکھایا، اور کہنے لگی کہ میں اسی کو پوجتی ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس کی عبادت نہیں
کرسکتے۔ اس کے بعد دونوں فرشتے چلے گئے اور جب تک اللہ نے چاہا صبر سے کام لیا۔ پھر اس عورت کے پاس آئے اور اس
سے میٹھی میٹھی باتیں شروع کردیں۔ لیکن اس نے اس مرتبہ بھی یہی شرط رکھی کہ تم میرا دین اختیار کرلو تو تمہاری بات مانوں گی۔ فرشتوں نے
اس مرتبہ بھی یہی جواب دیا کہ ہم تمہارا دین نہیں اختیار کرسکتے۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ بت پوجنے پر کسی طرح تیار نہیں ہیں تو اب اس
نے ایک نئی تجویز رکھی اور کہا کہ تین کاموں میں سے کوئی ایک کام تم کرلو تو میں تمہاری بات مان لوں گی، بُت کو پوجو، یا کسی آدمی کو قتل کرو یا
شراب پیو۔ فرشتوں نے کہا کہ ان میں سے کوئی بات بھی مناسب نہیں ہے لیکن شراب پی لینا ان تینوں میں سب سے کم درجہ کا
گناہ ہے۔ چنانچہ اس نے انھیں شراب پلائی۔ جب وہ نشے میں ہوگئے تو اس کے ساتھ بدکاری کی۔ اتنے میں ایک شخص ادھر سے گذرا
انھیں خیال گذرا کہ یہ شخص ہمارا راز فاش کردے گا، اس لیے انھوں نے اسے قتل کردیا۔ جب نشہ اترا تو انھیں تنبہ ہوا کہ کتنا بڑا گناہ
وہ کر گذرے ہیں۔ اب انھوں نے چاہا کہ آسمان پر چڑھ جائیں، لیکن انھیں اس کی قدرت نہ ہوسکی۔ آسمان و زمین کے درمیان کا پردہ
ہٹا دیا گیا اور فرشتوں نے بھی ان کے گناہ کو دیکھا۔ انھیں بڑی حیرت ہوئی اور انھوں نے اعتراف کیا کہ واقعی انسان جو حقیقت
حال کو خود نہیں دیکھتے غنیمت ہیں۔ اس کے بعد وہ انسانوں کے لیے مغفرت کی دعا کرنے لگے۔ دونوں فرشتوں کو دنیا کے عذاب
اور آخرت کے عذاب کے درمیان اختیار دیا گیا اور انھوں نے دنیا کا عذاب، عذاب آخرت کے مقابلہ میں پسند کیا اور کہا کہ دنیا کا
عذاب تو ایک دن ختم ہوجائے گا، لیکن آخرت کا عذاب کبھی ختم نہیں ہوگا۔[1] اسی طرح کی ایک روایت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے۔

سحر کی حقیقت

"ببابل" کے متعلق کئی اقوال ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مراد بابل دنیا وند ہے یعنی عراق۔ سدی
اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہی روایت ہے۔ "سحر" (جادو) کے سلسلے میں بھی مختلف اقوال نقل ہوئے
ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ ایک دھوکہ اور خلافِ عادت چیزوں کا ظاہر ہونا ہے، ساحر (جادوگر) ایسے معمولات کرتا ہے کہ
مسحور (جس پر جادو کیا گیا ہو) کے خیال میں چیز اپنی اصلیت کے خلاف ظاہر ہوتی ہے، اس کی مثال سراب کی سی ہے، دُور سے دیکھنے
والا اسے پانی سمجھ جاتا ہے، حالانکہ ہوتا وہ ریت ہے۔ اسی طرح دور سے آدمی جب کوئی چیز دیکھتا ہے تو ہوتی وہ کچھ ہے اور نظر کچھ
اور آتی ہے، کشتی پر سوار کو، جب کشتی رواں دواں ہو، ایسا لگتا ہے کہ درخت اور پہاڑ بلکہ ساری ہی کائنات اس کے ساتھ اسی
رفتار سے رواں دواں ہے۔ ان حضرات کا خیال ہے کہ جس شخص پر جادو ہوتا ہے اس کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے، جادو کے
اثر کر جانے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو کام وہ کر رہا ہے یا جو چیز دیکھ رہا ہے وہ حقیقت کے خلاف ہے۔
عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل کے قبیلہ بنو زریق کے ایک لبید بن اعصم نامی یہودی نے رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] نعوذ باللہ، کہاں اللہ کے فرشتے اور کہاں یہ لغویات و خرافات!۔ اللہ کے کلام میں یہودیوں کے ذوق تحریف کا اس سے اندازہ لگایا
جاسکتا ہے۔ اللہ کی نافرمانی اس کے قہر و غضب کا باعث ہے، اگرچہ ان خرافات میں ہاروت و ماروت پر بھی عذاب الٰہی کو دکھایا گیا ہے، لیکن
بحیثیت مجموعی نفسیاتی طور پر ذہنوں سے نافرمانی اور گناہ کی اہمیت کم کرنے میں اس طرح کے واقعات سے مدد ملتی ہے۔ بنی اسرائیل
نافرمانی اور اس کے نتیجہ میں اللہ کے غضب و عذاب کے عادی ہوچکے تھے۔ یہ واقعات بھی ان کے اسی مخصوص مزاج کے آئینہ دار
ہیں۔ (مترجم)

Marfat.com

علیہ وسلم پر جادو کیا تھا۔ اس کا اثر آپ پر یہ ہوا تھا کہ آپ خیال کرتے کہ میں فلاں کام کروں گا، حالانکہ آپ اسے نہیں کرتے تھے۔ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے اس سلسلے میں تفصیلی روایت یہ ہے کہ قبیلہ بنی زریق کے یہودیوں نے آں حضورؐ پر جادو کردیا تھا اور ٹوٹکے کو قبیلہ حزم کے ایک کنویں میں ڈال آئے تھے۔ اس کا اثر آں حضورؐ پر یہ ہوا کہ آپ اپنی آنکھ سے دیکھی ہوئی چیز کو بھی حقیقت نہ سمجھتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو حقیقت حال بتادی اور آپ نے قبیلہ حزم کے کنویں پر اپنا آدمی بھیج کر ٹوٹکے کو نکلوایا۔ پھر آپؐ نے صحابہ رضؓ سے ارشاد فرمایا کہ مجھ پر بنو زریق نے جادو کیا تھا۔

جن مفسرین کا یہ خیال ہے کہ جادو سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدلتی، بلکہ جادو محض ایک طرح کا دھوکا اور فریب ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر جادو سے کسی چیز کی بھی حقیقت بدل جاتی تو پھر حق و باطل میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا، جادوگر تمام ہی چیزوں کی ہیئت و اصلیت بدل کر رکھ دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے جادوگروں کے متعلق بھی یہی ارشاد فرمایا ہے کہ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى " (پس یکایک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں موسیٰ کے خیال میں ان کے جادو کے زور سے ایسی نظر آنے لگیں کہ گویا وہ دوڑی پھر رہی ہیں)۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں بھی آں حضورؐ کے متعلق "يُخَيَّلُ" (آپ کو خیال گذرتا تھا) کا لفظ ہی آیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جادو سے صرف مسحور کا تخیّل اور ذہن متاثر ہوجاتا ہے۔ اس سے زیادہ اس کی اور کوئی حقیقت نہیں۔ لیکن بعض دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ جادوگر اپنے جادو کے زور سے انسانوں کو جسمانی طور پر گدھا بنا سکتا ہے اور حقیقت اور جسم میں بھی تبدیلی لاسکتا ہے۔ اپنے اس خیال کی تائید میں یہ حضرات عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ایک روایت سے استدلال کرتے ہیں۔

روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دومۃ الجندل کی ایک عورت آئی، وہ آں حضورؐ سے جادو کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتی تھی، اسے جادو سے سابقہ پڑچکا تھا لیکن اس کا حکم معلوم نہیں تھا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عروہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ جب اس عورت نے حضور اکرمؐ کو نہیں پایا تو زار و قطار رونے لگی۔ اس پر مجھے بڑا ترس آیا۔ وہ کہتی تھی کہ مجھے خوف ہے کہ میں ہلاک و برباد ہوچکی ہوں۔ میرا شوہر اتفاق سے کہیں لاپتہ ہوگیا۔ میں ایک بڑھیا کے پاس گئی اور اسے سب کچھ سنایا تو اس نے کہا کہ تم میرے کہنے کے مطابق عمل کرو تو وہ تمہارے پاس آنے لگے گا۔ چنانچہ رات کے وقت وہ دو سیاہ کتے لائی۔ ایک پر میں سوار ہوگئی اور دوسرے پر وہ۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم بابل میں تھے۔ وہاں دو مرد تھے جن کا پاؤں اوپر کرکے انھیں کسی نے لٹکا رکھا تھا۔ ان دونوں نے پوچھا، تم یہاں کس مقصد سے آئی ہو؟ اس پر میں نے پوچھا، کیا تم جادو جانتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم تو محض باعث آزمائش ہیں، تم کفر نہ کرو اور واپس چلی جاؤ۔ میں نے انکار کیا اور کہا کہ میں واپس نہیں جاؤں گی۔ انھوں نے کہا پھر اس تنور کے پاس جاؤ اور اس میں پیشاب کرآؤ۔ میں وہاں پہنچی، لیکن گھبرا گئی اور پیشاب کیے بغیر واپس آگئی۔ انھوں نے پوچھا، تم نے کردیا؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں۔ اس پر انھوں نے پوچھا، تم نے وہاں کچھ دیکھا بھی؟ میں نے کہا کہ میں نے تو کوئی چیز نہیں دیکھی۔ انھوں نے کہا کہ پھر تم نے کچھ نہیں کیا، اب بھی تم اس کام سے باز آجاؤ، اپنے گھر واپس چلی جاؤ اور کفر نہ کرو۔ لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی۔ اس لیے انھوں نے مجھ سے دوبارہ اس تنور میں پیشاب کرنے کے لیے کہا۔ میں اس مرتبہ بھی گھبرا کے واپس آگئی اور ان سے کہا کہ میں کرآئی ہوں، لیکن اس مرتبہ انھوں نے کہا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو، تم نے کچھ نہیں کیا ہے، اب بھی اپنے گھر چلی جاؤ اور کفر نہ کرو، کیونکہ ابھی تو ابتدا ہے، سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔ میں نے اس مرتبہ بھی ان کی بات نہیں مانی، تو انھوں نے مجھ سے پھر تنور میں پیشاب کرنے کے لیے کہا۔ میں گئی اور اس مرتبہ میں نے پیشاب کردیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک ہتھیار بند سوار مجھ میں سے نکلا اور آسمان کی طرف چلا گیا اور میری نظروں سے غائب ہوگیا۔ اب میں پھر ان دونوں آدمیوں کے پاس آئی۔ انھوں

(ابن جریر ج ۳)

نے کہا کہ یہ تمہارا ایمان تھا جو تمہارے اندر سے نکل چکا ہے، اب جاؤ۔ میں نے واپس آکر اس بوڑھی عورت سے کہا کہ اب تو آگے مجھے کچھ معلوم نہیں اور نہ انھوں نے مجھ سے کچھ کہا ہی۔ بڑھیا نے کہا کہ ٹھیک ہے، اب تم جو ارادہ کروگی وہ ہو جائے گا، یہ گیہوں کا دانہ لو اور اسے بو کے دیکھ لو۔ چنانچہ میں نے گیہوں کے دانہ سے کہا کہ اُگ جا، وہ فوراً اگ گیا۔ میں نے کہا، پتے نکل آ، تو اس میں پتے بھی نکل آئے، میں نے کہا دانے پیدا ہوجا تو دانے بھی ہوگئے۔ میں نے کہا، خشک ہوجا تو وہ خشک ہوگئے۔ میں نے کہا، پس جا تو وہ پس گئے۔ میں نے کہا! روٹی پک جا تو روٹی پک کے تیار ہو گئی۔ جب میں نے دیکھا کہ میں جس چیز کا بھی ارادہ کرتی ہوں وہ ہو جاتی ہے تو ام المؤمنین اللہ گواہ ہے، مجھے شرم آئی۔ خدا کی قسم نہ میں نے جادو کبھی کیا اور نہ کبھی کرنے کا ارادہ ہے۔[1]

جن حضرات کا یہ خیال ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آیت میں دونوں فرشتوں کے متعلق اتنی بات تو صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ "لوگ ان سے وہ سیکھ لیتے تھے جس سے وہ جدائی ڈال دیتے درمیان مرد اور اس کی بیوی کے" اگر جادو صرف ایک تخیّل ہوتا تو اس سے حقیقت اور مشاہدہ میں میاں بیوی میں جدائی نہیں پیدا ہوسکتی تھی۔ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ جادو ایک طرح کی نظر بندی ہے۔

فرشتوں کی طرف سے تنبیہ

"وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ" یعنی وہ دونوں فرشتے کسی کو بھی وہ میاں اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کا فن جو اُن پر اُتارا گیا تھا، نہیں سکھاتے تھے، جب تک یہ نہ کہدیتے کہ ہم تو بس انسانوں کے لیے ایک آزمائش ہیں، سو تم کہیں اپنے رب سے کفر نہ اختیار کرلینا، سدی سے اسی طرح آیت کا معنی منقول ہے۔ قتادہ اور حسن رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا کہ دونوں فرشتوں کو حکم تھا کہ جب بھی کسی کو بتائیں تو پہلے یہ کہدیں کہ "ہم تو محض ذریعہ آزمائش ہیں، سو تم کہیں کفر نہ اختیار کرلینا"۔

معمر اور ابن جریج رحمۃ اللہ علیہما سے بھی یہی روایت ہے۔ "فِتْنَةٌ" آیت میں امتحان اور آزمائش کے معنی میں ہے۔ بولتے ہیں "فَتَنْتُ الذَّهَبَ فِي النَّارِ" یعنی میں نے سونے کو آزمانے کے لیے آگ میں ڈالا، کہ کھرا ہے یا کھوٹا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے "فِتْنَةٌ" کا معنی آزمائش منقول ہے۔

"فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ" اس آیت میں بھی انھیں یہودیوں کے متعلق بتایا جا رہا ہے جو دونوں فرشتوں سے جادو سیکھ ہی لیتے تھے۔ آیت ایک الگ جملہ ہے، جملہ مستانفہ۔ پہلی آیت کے جواب کے طور پر نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں فرشتے ہاروت و ماروت حق و باطل کو ان کے سامنے صاف کردیتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ ہم تو محض ذریعہ آزمائش ہیں، تم کفر نہ اختیار کرلینا۔ لیکن وہ ان کی بات نہ مانتے اور ان سے وہ علم سیکھ ہی لیتے جس سے وہ جدائی ڈال دیتے درمیان مرد اور اس کی بیوی کے"۔

بعض حضرات مفسرین نے اس آیت کو اس سے پہلی آیت "وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا الخ" پر عطف قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہاں تاخیر با حقہ التقدیم کے قاعدہ پر عمل ہوا ہے۔ لیکن ہم نے جو تفسیر پہلے کی وہی زیادہ مناسب ہے، "مِنْهُمَا" کی ضمیر سے مراد "مَلَكَيْنِ" (دو فرشتے یعنی ہاروت و ماروت) ہیں، یعنی وہ لوگ ان دونوں فرشتوں سے وہ علم سیکھ ہی لیتے تھے جس کے ذریعہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے۔ لفظ "ما" اَلَّذِیْ (جو) کے معنی میں ہے، بعض مفسرین نے اس سے جادو مراد لیا ہے

---

[1] روایت گھڑی ہوئی اور موضوع ہے، عقلاً و نقلاً ہر حیثیت سے !۔ اگر بالفرض روایت معتبر ہوتی، پھر بھی ایک ایسی عورت کے بیان پر جس کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے، کسی مسئلہ کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ (مترجم)

Marfat.com

اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جادو کے علاوہ کوئی اور علم مراد ہے جس کے ذریعہ وہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے تھے "اَلْمَرْءُ" انسانوں میں سے مرد کو کہتے ہیں۔ اور عورت کے لیے "اَلْمَرْءَةُ" استعمال ہوتا ہے۔ "زَوْجِه" میں زوج کے معنی ہیں مرد کی بیوی۔ عورت کے شوہر کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ استعمال اہلِ حجاز کی زبان کے مطابق ہے لیکن قبیلہ تمیم، بنی قیس کے بہت سے قبائل اور نجد میں بیوی کے لیے "زَوْجَةٌ" اور شوہر کے لیے "زَوْجٌ" استعمال ہوتا ہے۔
جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے کہ جادو کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اس کے زور سے انسان کے خیال میں حقیقت اور اصلیت کے خلاف ایک چیز پیدا کر دی جاتی ہے۔ اگر ہمارا یہ نقطۂ نظر صحیح ہے تو میاں بیوی کے درمیان جادو کے زور سے جدائی ڈالنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے ذریعہ دونوں کے ذہن سے ایک دوسرے کی ظاہری اور باطنی خوبی کا خیال محو کر دیا جاتا ہے اور اس کے خلاف قباحت اور برائی کا تصور پیدا کر دیا جاتا ہے، اب دونوں ایک دوسرے کو برا سمجھنے لگتے ہیں اور ان میں پھوٹ پڑ جاتی ہے اور نتیجہ میں دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ گویا جادو گر اس جدائی اور پھوٹ کا سبب بنا ہے، اس لیے اس کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہی تفسیر نقل ہوئی ہے۔
جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ فرشتے لوگوں کو میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کا علم نہیں سکھاتے تھے، وہ یہ کہتے ہیں کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "پس وہ دونوں فرشتے جو علم انھیں سکھاتے تھے، وہ اس کے بجائے وہ علم سیکھ لیتے تھے جس سے وہ جدائی ڈالتے میاں اور بیوی کے درمیان" یعنی فرشتے انھیں کچھ اور سکھاتے تھے لیکن وہ فرشتوں کا علم نہیں سیکھتے، بلکہ اسے چھوڑ کر میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے والا علم سیکھتے تھے۔ محاورہ کی حد تک یہ بھی صحیح ہے اور اشعارِ عرب میں اس طرح کی ترکیب استعمال ہوتی ہے۔ "وَمَا هُمْ بِضَارِّيْنَ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ" یعنی جو لوگ دونوں فرشتوں ہاروت و ماروت سے وہ علم سیکھتے تھے جس کے ذریعہ میاں اور بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے تھے، وہ اس علم کے ذریعہ کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، مگر ہاں جس کے بارے میں اللہ کا فیصلہ اور اس کی تقدیر ہی یہ ہو کہ جادو اسے نقصان پہنچائے گا۔ لیکن جسے اللہ جادو کے نقصان سے بچانا چاہتا ہو اسے وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ "اِذن" کلامِ عرب میں مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک معنی "اجازت" ہے۔ لیکن آیت میں یہ معنی مراد نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بلا وجہ میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کے لیے جادو کے علاوہ دوسرے طریقوں سے کام لینے کو بھی حرام قرار دیا ہے، ظاہر ہے کہ جادو کے ذریعہ ایسی کوشش تو بہرحال حرام ہوگی، کہ جادو کرنا خود حرام ہے۔ دوسرا معنی "اذن" کا کسی چیز کا جاننا، خبر رکھنا ہے۔ بولتے ہیں "قَدْ اَذِنْتُ بِهٰذَا الْاَمْرِ" یعنی مجھے یہ بات معلوم ہے، میں اس سے واقف اور خبردار ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ" (تو خبردار ہو جاؤ جنگ کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے)۔ آیت میں بھی یہی معنی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے علم (یعنی تقدیر) میں پہلے ہی سے یہ ہوتا ہے کہ فلاں جادو فلاں کو نقصان پہنچائے گا اور اسی کو نقصان اس سے پہنچتا ہے، اس کے علاوہ کسی کو نہیں پہنچتا یعنی جادو کے ذریعہ نقصان اللہ کی مشیت اور اس کی تقدیر پر موقوف ہے، مشیتِ الٰہی کے خلاف جس طرح اور کوئی کام نہیں ہو سکتا، اسی طرح جادو سے نقصان بھی نہیں پہنچ سکتا۔
چنانچہ سفیان رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "بِاِذْنِ اللّٰهِ" کا مطلب ہے "بِقَضَاءِ اللّٰهِ" یعنی قضاءِ الٰہی اور ارادۂ الٰہی کے بغیر کسی کو جادو سے نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ "وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ" یعنی یہ لوگ جو دونوں فرشتوں سے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کا علم سیکھتے ہیں، یہ ان کے دین کو نقصان پہنچاتا ہے اور انھیں آخرت میں کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ ہاں، دنیا میں وہ

Marfat.com

ضرور اس کے ذریعہ کچھ کما کھا لیتے ہیں۔

"لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ" (اور یہ خوب جانتے ہیں کہ جس نے اسے اختیار کرلیا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں)۔ مراد مدینہ کے وہی یہودی ہیں جنھوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا تھا اور سحر و جادو کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ارشاد ہے کہ یہ لوگ جنھوں نے میری کتاب کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اس کے حکم کے مطابق آپ کی اتباع نہیں کرتے، بلکہ اس کے بجائے اس جادو کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جسے شیطان سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں پڑھا کرتے تھے اور اس کے بھی پیچھے لگے ہوئے ہیں جو بابل میں ہاروت و ماروت دو فرشتوں پر اتارا گیا تھا، انھیں خوب معلوم ہے کہ جس شخص کے بھی اعمال ایسے ہوں اور جو بھی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے مقابلہ میں جادو و سحر کو ترجیح دے اسے آخرت کی نعمتوں کا کوئی حصہ نہیں مل سکتا۔ قتادہ، سدی، مجاہد اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم سے یہی تفسیر نقل ہوئی ہے کہ مراد آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودی ہیں اور یہ کہ جادوگر کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اس کا انھیں خوب علم تھا، خود ان کی کتاب توراۃ میں انھیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ "خَلَاق" کے مفہوم کے سلسلے میں علماء کے کئی اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے اس کا مفہوم نصیب، حصہ بیان کیا ہے۔ یہ قول مجاہد، سدی اور سفیان رحمہم اللہ سے روایت ہے۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا مفہوم "حجت، دلیل" بیان کیا ہے۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ سے "دین" منقول ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ "خَلَاق" کا معنی آیت میں نصیب اور حصہ ہے۔ کلام عرب میں عموماً اس معنی میں اس کا استعمال ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "اِنَّ اللّٰهَ لَيُؤَيِّدُ هٰذَا الدِّيْنَ بِاَقْوَامٍ لَا خَلَاقَ لَهُمْ" (اللہ تعالیٰ اس دین کی مدد ایسی قوموں کے ذریعہ بھی کریگا جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہوگا) میں بھی "خَلَاق" حصہ ہی کے معنیٰ میں ہے۔ آیت "مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ" کا بھی یہی مفہوم ہے یعنی آخرت میں اسے کوئی حصہ نہیں ملے گا، کیونکہ نہ اس کے پاس دین و ایمان تھا اور نہ عمل صالح۔ آیت میں صرف "خَلَاق" کا ذکر ہے، یعنی اسے آخرت میں حصہ نہیں ملے گا، لیکن مراد جنت اور اجر و ثواب کا حصہ ہے، کیونکہ جہنم کا حصہ تو اسے ملے گا ہی۔

کاش عقلِ سلیم سے کام لیتے

"وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ"، یعنی وہ چیز بہت ہی بُری ہے جس کے بدلہ میں انھوں نے جادو سیکھ کر اپنے آپ کو بیچ ڈالا ہے۔ کاش اس کے سوءِ انجام کو وہ جانتے!۔ اس سے پہلے بھی ہم بیان کرچکے ہیں کہ "شَرَوْا" بمعنی "بَاعُوْا" (بیچا) ہے۔ سدی سے یہی روایت ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیت میں اس پر تاسف ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ جادو سیکھنے سکھانے کے بُرے انجام سے واقف نہیں ہیں، کاش اس سے وہ واقف ہوتے!۔ حالانکہ اس سے پہلے کی اسی کے متعلق آیت میں ارشاد ہے کہ "لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ" (اور یہ خوب جانتے ہیں کہ جس نے اسے اختیار کرلیا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں)۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے بُرے انجام سے واقف تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں تقدیم ماحقہ التاخیر کے اصول سے کام لیا گیا ہے، یعنی زیر تفسیر آیت معنی اور مفہوم کے اعتبار سے "لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ" سے پہلے ہے اور دونوں میں دو مختلف طبقوں کو خطاب کیا گیا ہے۔ "وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ" الخ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "حالانکہ وہ کسی کو بھی ارادہ الٰہی کے بغیر نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور یہ وہ چیز سیکھتے ہیں جو انھیں نقصان پہنچا سکتی ہے، نفع نہیں پہنچا سکتی، اور بہت ہی بُری ہے وہ چیز جس کے بدلے میں انھوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا ہے، کاش وہ جانتے۔"

Marfat.com

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے فعل کی مذمت کی ہے جو براہِ راست دونوں فرشتوں سے مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کا طریقہ سیکھتے تھے، اور پھر ان کی مذمت کی ہے کہ انھوں نے جادو سیکھ کر اور اس سے دلچسپی لے کر اپنے دین کے عوض بہت ہی بری چیز خریدی، ان کا دین انھیں تباہی سے بچاتا لیکن ان کا یہ عمل انھیں انجام کار تباہ و برباد کردے گا، کاش وہ جانتے ہوتے کہ ان کے اس عمل کا انجام کیا ہوگا!۔

اصل میں جو لوگ فرشتوں سے میاں اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کا طریقہ سیکھتے تھے وہ نہ اللہ کی معرفت رکھتے تھے، نہ اس کے حلال و حرام کی انھیں کوئی تمیز تھی اور نہ اس کے امر و نہی کی۔ اس کے بعد اس فریق کو مخاطب کیا گیا ہے جن کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ انھوں نے کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دیا ہے، جیسے انھیں کوئی علم ہی نہ ہو، اور اس علم کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جیسے سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں شیطان پڑھا کرتے تھے اور اس علم کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جو بابل میں ہاروت و ماروت پر اتارا گیا تھا" اور پھر ان سے کہا جا رہا ہے کہ "یہ خوب جانتے ہیں کہ جس نے اسے اختیار کر لیا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں"۔

اس طبقہ (یعنی یہود بنی اسرائیل) کے متعلق اطلاع دی جا رہی ہے کہ وہ اللہ کے حدود اور اس کے حلال و حرام سے خوب واقف ہیں، لیکن اس کے باوجود شرک و کفر سے باز نہیں آتے اور شیطانی علوم کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ وہ دشمنی، اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ سرکشی کی وجہ سے کر رہے ہیں، حالانکہ واقف ہیں کہ اس سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے کتنا سخت عذاب ان پر ہوگا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ "لَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ" سے مراد شیاطین ہیں اور "لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ" سے مراد انسان ہیں۔ لیکن یہ تفسیر غلط ہے اور معتبر مفسرین کی تفسیر کے خلاف ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ" اور "لَقَدْ عَلِمُوا" دونوں آیتوں سے ایک ہی جماعت (یعنی یہود بنی اسرائیل) مراد ہے۔ ایک جگہ انھیں کے متعلق کہا گیا کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ جس شخص کے بھی اعمال ایسے ہوں گے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا"، کیونکہ کتاب الٰہی کے ذریعہ انھیں ان چیزوں سے منع کیا گیا تھا اور وہ خوب واقف تھے کہ اس کے باوجود اگر وہ اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں تو آخرت میں ہلاکت و بربادی کے سوا اور وہ کچھ نہ پائیں گے۔ لیکن اس کے فوراً ہی بعد انھیں کے متعلق کہا گیا "اور بہت ہی بری ہے وہ چیز جس کے بدلہ میں انھوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا ہے، کاش وہ اتنا ہی جانتے"، اور اس آیت میں ان کے علم کی نفی کر دی، کیونکہ انھوں نے اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کیا تھا اور عام محاورہ میں عالم اس کو کہتے ہیں جو اپنے علم پر عمل بھی کرتا ہو، اگر اس کا عمل علم کے خلاف ہے تو پھر اس میں اور جاہلوں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ ایسے شخص کو جو کسی چیز کے علم کے باوجود اپنے علم کے خلاف عمل کرتا ہو، عرب میں کہتے "لَوْ عَلِمْتَ لَا اقْتَصَرْتَ" (اگر تمہیں علم ہوتا تو تم کوتاہی نہ کرتے)، آیت میں بھی یہی صورت ہے کہ اگرچہ یہودیوں کو اس کا علم تھا کہ جادو وغیرہ جیسے منکرات کا سیکھنا اور ان پر عمل کرنا ان کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے لیکن اس کے باوجود سیکھتے تھے، اور اسی لیے کہا گیا کہ "کاش، وہ اتنا ہی جانتے"۔

اس تفسیر کے لیے اگرچہ کلام عرب میں گنجائش ہے، لیکن آیت کی ظاہری ترتیب اور اس کے انداز خطاب کے خلاف ہے پہلے تاکید کے ساتھ کہا گیا ہے کہ انھیں خوب معلوم ہے، اور پھر اس کے بعد دوسری آیت ہے کہ "کاش، وہ اتنا ہی جانتے" جن کی زبان میں قرآن مجید نازل ہوا ہے، ان کے یہاں ان محاوروں کے استعمال کا جو متعارف طریقہ ہے، اس کے پیش نظر یہ نہیں جا سکتا کہ دونوں آیتوں سے ایک ہی جماعت مراد ہے۔ آیت کی ظاہری ترتیب یہی بتاتی ہے کہ دو مختلف جماعتیں دونوں

Marfat.com

آیتوں سے مراد ہیں۔

" وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ " یعنی وہ لوگ جو فرشتوں سے وہ علم سیکھتے تھے جس کے ذریعہ میاں اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے، اگر یہ لوگ ایمان لاتے اور اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کرتے، اپنے پالنے والے سے ڈرتے، اس کی سزاؤں کا انھیں خوف ہوتا، اور اس لیئے وہ اس کی طاعت و فرماں برداری کرتے اس کے فرائض و احکام کو بجالاتے اور گناہوں سے بچتے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے ایمان و تقویٰ کا بدلہ، جادو سیکھنے اور اس کے ذریعہ جو کچھ انہوں نے کمایا ہے، ان سب سے کہیں زیادہ بہتر ہوتا، کاش وہ اتنا جانتے کہ اللہ تعالیٰ کا ایمان و عمل صالح پر ثواب، جادو اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی چیزوں سے کس درجہ بڑھ کر ہے " اس آیت میں بھی ان کے علم کی نفی کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ثواب کی بہترائی سے واقف نہیں ہیں۔ " مَثُوْبَةٌ " کلام عرب میں مصدر ہے، اس کی اصل " ثَابَ اِلَيْكَ الشَّيْئُ " ہے، لوٹنے کے معنی ہیں، یعنی تمہاری طرف چیز لوٹ کے آگئی۔ اسی سے بولتے ہیں " اَثَبْتُهٗ اِلَيْكَ " یعنی میں نے چیز تمہیں لوٹا دی۔ ھدیہ یا کسی اور چیز کے بدلہ میں کوئی شخص اگر کسی کو کوئی چیز لوٹا کر دے تو اس کے لیئے " اِثَابَة " کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کا ہر اس چیز پر اطلاق ہونے لگا جو عوض و بدلہ میں دی جائے، خواہ اس کی نوعیت کچھ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو " ثواب " کی بھی یہی صورت ہے کہ وہ ان کے اعمال کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جائے گا۔ قتادہ، سدی اور ربیع رحمہم اللہ سے یہی روایت کہ " لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ " سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب ہے اور " مَثُوْبَةٌ " یعنی ثواب ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا

اے ایمان والو! تم (لفظ) راعنا مت کہا کرو اور انظرنا کہہ دیا کرو۔

وَاسْمَعُوْا وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اور اس (حکم) کو (اچھی طرح) سن لیجیو۔ اور (ان) کافروں کو (تو) سزائے دردناک ہو (ہی) گی۔ ذرا بھی پسند نہیں کرتے کافر لوگ (خواہ)

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ

ان اہل کتاب میں سے (ہوں) اور (خواہ) مشرکین میں سے اس امر کو کہ تم کو کسی طرح کی بہتری (بھی) نصیب ہو تمہارے

مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ

پروردگار کی طرف سے حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت (و عنایت) کے ساتھ جس کو منظور ہوتا ہے مخصوص فرما لیتے ہیں اور اللہ بڑے فضل

الْعَظِيْمِ ۝

(کرنے) والے ہیں۔

۱۳۳۹۷

Marfat.com

بارگاہِ رسالت کے آداب

"یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا" (اے ایمان والو "رَاعِنَا" مت کہا کرو) "رَاعِنَا" کے مفہوم کے سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ عطاء اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہما سے روایت ہے کہ اس کا معنیٰ ہے "خلاف"۔ "لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا" یعنی خلاف بات مت کہا کرو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ "آپ ہمارے سننے کی بھی رعایت کیجیے، یعنی ہماری باتیں بھی سنا کریں اور گفتگو بھی اسطرح فرمائیں کہ ہم بھی آپ کی بات سن لیں"۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی روایت ہے۔ ضحاک اور ایک روایت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی ہے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بارگاہِ رسالت میں یہ لفظ کہنے سے کیوں منع کیا تھا؟ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ کلمہ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آنحضورؐ کو مخاطب کر کے محض مذاق کے طور پر اور گالی دینے کے لیے کہتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس کے استعمال سے منع کر دیا۔ پہلے چند یہودیوں نے آں حضورؐ کی مجلس میں، آں حضورؐ مجلس میں لوگوں کو دین کی باتیں سناتے ہوتے، تو آکر ازراہِ عناد کہتے کہ "رَاعِنَا" یعنی ہماری بھی رعایت کیجیے، تاکہ ہم بھی آپ کی بات سن سکیں، اس کے بعد بعض مسلمانوں نے بھی اس کے ظاہری مفہوم کی وجہ سے یہ کلمہ مجلس میں کہنا شروع کر دیا تو اس کے استعمال کی ممانعت کر دی گئی اور کہا گیا کہ اے مسلمانو! "راعنا" مت کہا کرو۔

قتادہ، عطیہ، ابن زید اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت ہے۔

ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہاں "رَاعِنَا" کا وہی مفہوم ہے جو ایک دوسرے موقعہ پر قرآن مجید میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ "قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَیًّا بِاَلْسِنَتِھِمْ وَطَعْنًا فِی الدِّیْنِ" (اور کہتے ہیں کہ ہم نے سنا، مگر ہم نے مانا نہیں اور (ہماری) سنو، اور تمھیں سنوایا نہ جائے اور "رَاعِنَا" میں زبانوں کو توڑ موڑ کر دین میں طعنہ زنی کی راہ سے) فرمایا کہ "رَاعن" کے معنیٰ خطاء کے ہیں، مسلمانوں کو منع کیا گیا کہ یہ لفظ نہ استعمال کرو جس کا ظاہری اور معروف و مشہور مفہوم کے سوا ایک اور مفہوم بھی ہے، بلکہ ایسے موقعہ پر اس کے بجائے "اُنْظُرْنَا" (ہمارے اوپر نظر کیجیے) کہا کرو اور سنتے رہا کرو۔ آپ نے بیان کیا کہ صحابہ رضؓ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آپ کی طرف دیکھتے اور آپ سے کوئی بات کہتے تو آں حضورؐ ان کی بات سنتے تھے اور اگر کوئی چیز پوچھتے تو آں حضورؐ اس کا جواب دیتے تھے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ "رَاعِنَا" کا ایک معنیٰ، اس کے معروف و مشہور معنیٰ کے علاوہ "عَاطِنَا" بھی تھا، اور اسی بُرے معنیٰ کی وجہ سے صحابہ رضؓ کو یہ لفظ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں استعمال کرنے سے روک دیا گیا۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اسلام سے پہلے مدینہ میں انصار کے قبائل میں اس لفظ کا مجلسوں میں رواج تھا۔ گفتگو کے دوران مجلس میں بعض لوگ بولنے والے سے یہ مطالبہ کرتے کہ "ہماری بھی رعایت کرو، اور اس طرح بولو کہ ہم بھی سن سکیں" "رَاعِنَا" اس لیے اسلام کے بعد دورِ جاہلیت کے اس جملہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک مجلس میں کہنے کی ممانعت کر دی گئی۔ عطاء، ابو العالیہ اور ابن جریج رحمۃ اللہ علیہم سے یہ روایت منقول ہے۔ ابنِ جریج رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مزاحًا وہ اپنی مجلسوں میں یہ کلمہ کہا کرتے تھے، اس لیے آں حضورؐ کی مجلس میں اس کے استعمال سے انھیں منع کر دیا گیا۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ قبیلہ بنی قینقاع کے ایک یہودی، رفاعہ بن زید بن سائب نے سب سے پہلے حضور اکرمؐ سے گفتگو کرتے ہوئے یہ جملہ کہا۔ لیکن سدی نے نام صحیح نہیں بتایا ہے، وہ شخص ابن سائب نہیں، بلکہ ابن تابوت تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تھا اور آپؐ سے گفتگو کرتے وقت کہتا کہ "اِرْعِنِیْ سَمْعَکَ وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ" (ہمارے سننے کی رعایت کرو اور ہماری سنو اور تمھیں سنوایا نہ جائے) بعض مسلمانوں نے سمجھا کہ یہ کوئی ایسا جملہ معلوم ہوتا ہے جو انبیاء کی شان کے مناسب

Marfat.com

ہے اور تعظیماً ان سے گفتگو کرتے وقت اسے استعمال کرنا چاہیئے[۵۱]

سورۂ نساء میں اسی کے متعلق ارشاد ہے کہ "جو لوگ یہودی ہوگئے ہیں ان میں سے ایسے بھی ہیں جو کلام کو اس کے موقعوں سے پھیرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے سنا، مگر ہم نے مانا نہیں اور ہماری سنو اور تمھیں سنوایا نہ جائے اور "راعنا" میں بانوں کو توڑ موڑ کر دین میں طعنہ زنی کی راہ سے"۔ اسی لیئے مسلمانوں کو اس کلمہ کے استعمال کی ممانعت کر دی گئی۔ میرے نزدیک یہ کلمہ بھی ان بہت سے کلمات میں سے ہے جن کے استعمال کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیئے پسند نہیں کیا۔ حضور اکرم ص کا ارشاد ہے کہ انگور (عِنَب) کو "کَرْم" نہ کہا کرو (زمانہ جاہلیت میں انگور کے لیئے یہ لفظ بھی استعمال ہوتا تھا)، بلکہ "حبلہ" کہا کرو، اسی طرح آپ نے ارشاد فرمایا کہ (اپنے غلام کو) "عَبْدِی" (میرا غلام، میرا بندہ) نہ کہا کرو، بلکہ "فَتَایَ" (میرا جوان، میرا آدمی) کہا کرو اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں کہ عربی زبان میں دو الفاظ ایک ہی مفہوم کے لیئے استعمال ہوتے تھے، شریعت نے کسی معنوی کراہت کی وجہ سے ایک کے استعمال سے مسلمانوں کو روک دیا، اور اس کے مقابلہ میں دوسرے لفظ کے استعمال کو پسند کیا۔ آیت میں بھی اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں "رَاعِنَا" کہنے کی ممانعت کی گئی ہے اور اس کے بجائے ارشاد ہوا کہ "اُنْظُرْنَا" کہا کرو۔ غلام کو "عَبْدِیْ" کہنے کی ممانعت اس لیئے کی گئی تھی کہ تمام انسان، بلا کسی تخصیص کے اللہ تعالیٰ کے بندے (عبد) ہیں، اس لیئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ناپسند فرمایا کہ انسانوں کے ایک خاص گروہ کو جو کسی کی ملکیت میں کسی وجہ سے چلا گیا ہو، عَبْدِیْ (میرا غلام یا میرا بندہ) کہہ کر پکارا جائے، کیونکہ تمام انسان صرف اللہ کے بندے اور غلام (عَبْد) ہیں۔ اسی طرح انگور کو (جس کی شراب عرب کو جاہلیت میں بہت مرغوب تھی) "کَرْم" کہنے کی ممانعت اس لیئے آئی ہے کہ کہیں عام ذہن اسے "کَرَم" کے ساتھ متصف نہ سمجھنے لگیں۔ اگرچہ دونوں کے تلفظ میں فرق ہے، ایک کی راء ساکن ہے اور دوسرے کی متحرک، پھر بھی لفظی اشتباہ کافی تھا، اور اہل عرب بعض اوقات بول چال میں متحرک کو ساکن بھی بولتے تھے، اس لیئے اس اشتباہ کی وجہ سے ممانعت کر دی گئی، کیونکہ انگور (جو شراب بنانے کے لیئے استعمال ہوتا تھا) شریعت کی نظر میں کرامت کے وصف کے ساتھ ہرگز متصف نہیں ہو سکتا۔

یہی صورت "رَاعِنَا" میں بھی ہے، اس کے بھی دو مفہوم نکلتے تھے، اس کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ہماری رعایت و انتظار کیجئے اور ہم آپ کی رعایت و انتظار کریں۔ اور اس کا دوسرا مفہوم توجہ سے کلام سننا ہے۔ ادھر اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری طرح اور ہر ہر پہلو سے تعظیم و تکریم کا حکم دیتا ہے، آں حضور ص کے سامنے آپ کی آواز سے زیادہ بلند آواز کرنے کی بھی ممانعت ہے، آں حضور ص کی موجودگی میں بلند آواز سے نہ بولا جائے، ورنہ ڈر ہے کہ اس کی سزا میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بولنے والے کے تمام اعمال نامقبول ہو جائیں، اس لیئے یہاں پر بھی تنبیہ کی گئی کہ آں حضور ص سے مخاطبت میں کوئی ایسا لفظ زبان پر نہ آنے پائے جس میں سختی یا اکھڑپن ہو۔ الفاظ سامعہ نواز، خوب صورت اور حسین ہوں اور معانی میں بھی نرمی اور لوچ ہو۔

---

۵۱ کیونکہ یہودیوں کے متعلق اہل کتاب ہونے کی وجہ سے، اہل عرب یہ سمجھتے تھے کہ انبیاء کی سنتوں اور ان کی مجلس کے آداب سے یہ لوگ زیادہ واقف ہوں گے اور اس لیئے وہ ان کی باتوں اور ان کے طریقوں کی نقل کرتے تھے، حالانکہ انبیاء کی نسل میں سے ہونے کے باوجود وہ ایک نہایت معاند اور آزار پسند قوم تھی۔ اور یہ کلمہ بھی محض ان کے عناد اور دشمنی کا مظہر تھا۔
(مترجم)

Marfat.com

"راعنا" اس معیار پر پورا نہیں اترتا، اس لفظ سے سختی اور اکھڑپن کا اظہار ہوتا ہے، اس لیے حضور اکرم روحی فداہ سے مخاطبت میں اسے استعمال نہ کیا جائے۔ اگر تم آں حضورؐ کی باتیں پوری طرح نہیں سن یا سمجھ پاتے تو اس کے لیے ضرور کہو کہ آں حضورؐ ہماری رعایت کریں، لیکن درخواست کے لیے ایسے الفاظ کا استعمال کرو جس سے معلوم ہو کہ تمہارے دلوں میں آں حضورؐ کی تعظیم و تکریم ہے یہودیوں کی طرح بھدّے اور درشت الفاظ استعمال نہ کرو، کہ وہ آں حضورؐ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اسمع غیر مسمع"۔ ایک موقعہ پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "جو لوگ کافر ہیں خواہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے وہ اسے ذرا بھی پسند نہیں کرتے کہ تمہارے اوپر کوئی بھی بھلائی تمہارے پروردگار کی طرف سے اترے" اور اس آیت سے ہمارے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔

جن حضرات نے آیت کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ کلمہ "راعنا" یہودیوں کے یہاں ان کی اپنی زبان میں گالی اور مزاح کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور انھیں سے سن کر مسلمانوں نے بھی اس کا استعمال شروع کر دیا تھا، یہ قطعاً غلط ہے، یہ تو ممکن ہی نہیں کہ صحابہ اہلِ شرک و کفر کی ایسی زبان کا استعمال کرنے لگیں جن کا مفہوم انھیں خود نہ معلوم ہو اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گفتگو میں بھی اسے استعمال کریں۔ البتہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت قابلِ قبول ہو سکتی تھی کہ یہ کلمہ کلامِ عرب میں ایک مناسب اور صحیح مفہوم میں استعمال ہوتا تھا، لیکن اتفاق سے یہی لفظ یہودیوں کی اپنی زبان میں گالی اور مزاح کے لیے بولا جاتا تھا، یہودی آں حضورؐ کی مجلس میں اس کا استعمال شرارتاً کرتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو بھی اس کے استعمال سے منع کر دیا کہ یہودیوں کے لیے آں حضورؐ کی مجلس میں اس کلمہ کے استعمال کے لیے کوئی وجہ جواز باقی نہ رہے۔ لیکن یہ تفسیر کسی روایت سے ثابت نہیں ہے، اس لیے ہم نے جو تفسیر بیان کی ہے وہی مناسب اور صحیح ہے۔

"وَقُولُوا انْظُرْنَا" (اور "انظرنا" کہو)، یعنی اے مسلمانو! اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے "انظرنا" کہا کرو، یعنی "ہم پر نظر کیجیے، ہماری رعایت فرمائیے، تاکہ آں حضورؐ کے ارشادات کو ہم بھی سمجھ سکیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ"۔ "یہ وہ دن ہوگا جب منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے کہیں گی کہ ہمارا انتظار کرلو کہ ہم بھی تمہارے نور سے کچھ حاصل کرلیں۔" میں بھی "انظرونا" کا یہی مفہوم مراد لیا گیا ہے۔ "وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ" (اور سنتے رہا کرو، اور کافروں کے لیے عذاب دردناک ہے) یعنی جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے اور تمہارے رب کی کتاب کی جو آیات تمہارے سامنے تلاوت کی جاتی ہیں انھیں پوری توجہ سے سنو اور سمجھنے اور محفوظ رکھنے کی کوشش کرو۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح روایت ہے۔

پوری آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے ایمان والو، اپنے نبی سے "راعنا" مت کہا کرو، کہ جس میں جانبین سے رعایت اور افہام و تفہیم کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے، اس کے بجائے یہ کہا کرو کہ ہم پر نظر کیجیے، ہماری رعایت کیجیے تاکہ ہم بھی آپ کے ارشادات کو سمجھ سکیں، اور جو کچھ نبی کہتے ہیں اسے توجہ سے سنتے رہا کرو اور اسے محفوظ رکھو اور سمجھو۔ اس کے بعد اس طبقہ کے متعلق ارشاد ہے جو اللہ اور اس کے رسول کا انکار کرتا تھا۔ اور ان کے حکم کی مخالفت ضروری سمجھتا تھا کہ رسول کی تکذیب کا بدلہ آخرت میں دردناک عذاب ہے، "وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ" یعنی میرا اور میرے رسول کا انکار کرنے والوں پر دردناک عذاب ہے۔ "الیم" بمعنی "موجع، دردناک" ہے، اس سے متعلق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

خام خیالی | "مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ

مِنْ رَّبِّكُمْ" (جو لوگ کافر ہیں (خواہ) اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے وہ اسے (ذرا بھی) پسند نہیں کرتے کہ تمہارے اوپر کوئی بھی بھلائی تمہارے پروردگار کی طرف سے اترے)۔ یعنی اکثر اہل کتاب (اور مشرکین) پسند نہیں کرتے۔ "اَلْمُشْرِكِيْنَ" کا عطف "اَهْلِ الْكِتٰبِ" پر ہے اور اس لیے موضع جر میں ہے۔ "اَنْ يُّنَزَّلَ" "يَوَدُّ" کی وجہ سے موضع نصب میں ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ کافر ہیں، خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے وہ اسے ذرا بھی پسند نہیں کرتے کہ اللہ کے پاس جو خیر و بھلائی ہے وہ تمہارے اوپر نازل ہو، یہودی اور ان کی اتباع کرنے والے مشرکین محض حسد اور سرکشی کی وجہ سے چاہتے تھے کہ جو فرمان اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے اور اپنی حکمت اور آیات کی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی بھیجی ہے کاش اس کا سلسلہ کسی طرح بند ہو جاتا۔ اس آیت میں بہت واضح اور بہت صاف طور پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے دشمن اہل کتاب اور مشرکین سے تعلقات بڑھانے، ان کی باتوں کو توجہ سے سننے اور ان کی کسی بھی بات کو خیر خواہی اور نصیحت پر محمول کر کے ماننے اور قبول کرنے سے منع کیا، کیونکہ آیت میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین مسلمانوں سے حسد رکھتے ہیں اور ان کے بدخواہ ہیں چاہے وہ سامنے منہ پر اظہار کتنی ہی ہمدردی اور خیر خواہی کا کر رہے ہوں۔

"وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ" یعنی اللہ جسے چاہے اپنی نبوت و رسالت کے ساتھ خاص کر لے، پھر اسے اپنی مخلوق میں سے جس کی طرف چاہے بھیجے اور اپنی مخلوق میں سے جسے چاہے ایمان و ہدایت کی دولت دے۔ رحمت کے ساتھ کسی کو خاص کرنے (اختصاص) کا مفہوم یہ ہے کہ جسے خاص کیا ہے اسے ہی وہ رحمت ملتی ہے، دوسرے لوگوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اپنی رسالت سے اللہ تعالیٰ کا انبیاء کو خاص کرنا اور اپنی ہدایت کے ساتھ مومنین کو خاص کرنا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی تو ہے۔ اسی سے بندہ اپنے رب کی رضا، اس کی محبت اور کامیابی حاصل کرتا ہے۔ "وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ" میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع دی جا رہی ہے کہ جو بھی خیر و بھلائی بندہ کو دنیا اور دین میں ملتی ہے سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور بغیر کسی استحقاق کے محض اللہ کا فضل ہے۔ اس آیت میں اہل کتاب کی طرف تعریض ہے کہ مسلمانوں کو ایمان و ہدایت کی جو دولت ملی ہے وہ اللہ کا ان پر فضل ہے اور اس کی رحمت و نعمت محض خواہشات اور تمناؤں سے نہیں ملتیں اور نہ کسی بدخواہ کی بدخواہی سے زائل ہوتی ہیں۔ یہ تو اللہ کا فضل ہے اور اللہ اپنے فضل سے جسے چاہے مخصوص کر لے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ

ہم کسی آیت کا حکم جو موقوف کر دیتے ہیں یا اُس آیت (ہی) کو (ذہنوں سے) فراموش کر دیتے ہیں تو ہم اس آیت سے بہتر یا اُس آیت ہی کے مثل لے آتے ہیں (اے معترض) کیا

اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ہر شے پر قدرت رکھتے ہیں کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ایسے ہیں کہ خاص اُن ہی کی ہے سلطنت آسمانوں

وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

کی اور زمین کی اور (یہ بھی سمجھ رکھو کہ) تمہارا حق تعالیٰ کے سوا کوئی یار و مددگار بھی نہیں۔

نسخِ آیات کا مسئلہ

"مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ" یعنی ہم جس آیت کو بھی بدلتے ہیں یا اس میں تغیر کر کے دوسری کو اس کی جگہ

Marfat.com

رکھتے ہیں۔ " نسخ " (بدلنے، تغیر کرنے) کی صورت یہ ہے کہ کوئی حکم حلال تھا اسے حرام کر دیا، جو حرام تھا اسے حلال کر دیا، پہلے مباح تھا اب اسے ممنوع قرار دے دیا یا پہلے ممنوع تھا اب اسے مباح قرار دے دیا۔ شریعت کی اصطلاح میں نسخ امر و نہی، مقید و مطلق اور ممنوع و مباح کے سوا اور کسی چیز میں نہیں ہوتا، ایسا نہیں ہو سکتا کہ شریعت نے کوئی اطلاع و خبر دی ہو اور پھر اسے منسوخ کر کے اس کے بجائے دوسری خبر، جو پہلی سے مختلف ہو، بیان کی جائے۔ اصطلاح شریعت میں نسخ سے یہ ہرگز مراد نہیں۔ نسخ کا اصل مفہوم " نسخ الکتاب " میں ہے یعنی کتاب کے ایک نسخہ سے نقل کر کے اس کا دوسرا نسخہ بنانا۔ یہی صورت حکم کے " نسخ " میں بھی ہوتی ہے کہ ایک حکم کو بدل کر اسے دوسرے حکم میں لایا جاتا ہے۔ اس بنیاد پر جب کسی حکم کو بدل کر اس کی جگہ دوسرا حکم لایا جائے گا تو خواہ آیت جس میں پہلا حکم بیان ہوا تھا اسے جوں کا توں باقی رہنے دیا جائے یا آیت کو بھی باقی نہ رہنے دیا جائے، بہرحال دونوں صورتوں میں یہ حکم " منسوخ " کہلائے گا، اور جو حکم پہلے حکم کی جگہ لے گا اسے " ناسخ " کہا جائے گا۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح منقول ہے۔ مفسرین سے " مَا نَنْسَخْ " کے مفہوم کے سلسلے میں کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ " نسخ " بمعنی قبض ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے تفسیر یہ منقول ہے کہ " ہم جب آیت کو بھی بدلتے ہیں "۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں سے " نسخ " کا مفہوم " آیت کے الفاظ کو باقی رکھتے ہوئے اس کے حکم کو بدل دینا " نقل ہوا ہے۔ " اَوْ نُنْسِهَا " (یا بھلا دیتے ہیں)۔ علماء قراءت سے اس میں کئی اقوال نقل ہوئے ہیں اور اسی کے مطابق اس کے معنی کی تعیین میں بھی اختلاف ہے۔ اہل مدینہ اور اہل کوفہ کی قراءت میں یہ " نُنْسِهَا " ہے۔ اس قراءت کی بنیاد پر آیت کا مفہوم دو طرح بیان کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ " اے محمد! ہم جب آیت کو بھی منسوخ کر کے اس کے حکم کو بدلتے ہیں یا اسے بھلا دیتے ہیں اور اٹھا لیتے ہیں (تو اس سے بہتر لاتے ہیں)۔ یہ تفسیر قتادہ، مجاہد اور حسن بصری رحمہم اللہ تعالیٰ سے نقل ہوئی ہے۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے بھی یہی مفہوم منقول ہے، البتہ آپ " نُنْسِهَا " کے بجائے " تَنْسَاهَا " پڑھتے تھے، یعنی " اے محمد! آپ اسے بھلا دیتے ہیں " (اللہ کے حکم سے)۔ (آپ سے روایت نقل کرنے والے) قاسم نے عرض کی کہ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ تو " نُنْسِهَا " پڑھتے تھے تو آپ نے فرمایا کہ قرآن ابن مسیب پر نازل نہیں ہوا تھا اور نہ آلِ مسیب پر نازل ہوا تھا، (آپ نے فرمایا کہ دوسری آیات میں بھی یہ مضمون خطاب ہی کے صیغہ کے ساتھ آیا ہے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ " سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى " (ہم آپ کو (قرآن) پڑھا دیا کریں گے پھر آپ اسے نہ بھولیں گے) " وَاذْكُرْ رَبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ " (اور اپنے پروردگار کو یاد کر لیا کیجیے جب آپ بھول جائیں)۔

ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آیت کا مفہوم اسی کے مطابق نقل ہوا ہے کہ " نُنْسِهَا " بمعنی " نَرْفَعُهَا " (ہم اسے اٹھا لیتے ہیں) ہے۔ اسی قراءت کی بنیاد پر دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اسے ترک کر دینے اور چھوڑ دینے کے معنی میں لیا جائے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں دوسرے موقع پر بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، ارشاد ہے " نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ " یعنی ان لوگوں نے جب اللہ کو چھوڑ دیا تو اللہ نے بھی انہیں چھوڑ دیا۔ اس معنی کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم جب آیت کو بھی منسوخ کرتے ہیں اور اس کے حکم کو چھوڑ دیتے ہیں تو جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں اس سے بہتر یا اسی جیسی لے آتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، سدی، ضحاک اور ابن زید رحمہم اللہ سے یہی مفہوم نقل ہوا ہے کہ " اَوْ نُنْسِهَا " یعنی " یا ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں، بدلتے یا منسوخ نہیں کرتے "۔ اس کی ایک قراءت " اَوْ نَنْسَاْهَا " بمعنی " اَوْ نُؤَخِّرُهَا " (ہم اسے مؤخر کرتے ہیں)، بولتے ہیں " نَسَأْتُ هٰذَا الْاَمْرَ " یعنی میں نے اس معاملہ کو مؤخر کر دیا۔ اسی سے " بِعْتُہٗ بِنَسَاءٍ " ادھار پر بیچنے کے معنی میں آتا ہے۔ یہ قراءت صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت سے منقول ہے، کوفہ اور بصرہ کے علماء قراءت کی ایک جماعت سے بھی اسی طرح منقول ہے اور یہ معنی آیت کے بہت سے مفسرین نے مراد لیے

Marfat.com

ہیں چنانچہ عطاء، مجاہد ابن نجیح، عطیہ اور عبید بن عمیر رحمہم اللہ سے یہی مفہوم نقل ہوا ہے۔ اس مفہوم کی بنیاد پر آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ "اے محمد! ہم اپنی طرف سے نازل کی ہوئی آیت کی تلاوت کو باقی رکھتے ہوئے جب بھی اس کے حکم کو منسوخ کرتے ہیں یا اسے باطل و منسوخ بھی نہیں کرتے، بلکہ صرف مؤخر و ملتوی کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کے مثل لے آتے ہیں"

ہمارے نزدیک بہتر و اولیٰ قرارت "اَوْ نَنْسِهَا" بمعنی نترکہا (چھوڑ دیتے ہیں، اور تبدیلی نہیں کرتے) ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کسی حکم میں تغیر و تبدیلی کرتا ہے یا تغیر و تبدیلی نہیں کرتا تو اس سے بہتر یا اسی کے مثل لے آتا ہے۔ اس مفہوم کی تعیین کے بعد قابلِ غور چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو صورتیں بیان کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب وہ کسی آیت کے حکم میں تغیر و تبدیلی کرتا ہے پھر وہ کیا کرتا ہے اور دوسری یہ کہ جب آیت کے حکم میں تبدیلی نہیں کرتا پھر کیا کرتا ہے۔ ایک کا حکم جب بیان ہوا ہے تو مناسب ہے کہ ساتھ ساتھ دوسرے کا حکم بھی بیان ہو۔ دوسری صورت پہلے سے مختلف ہے اور کہا جا رہا ہے کہ پھر ہم اس سے بہتر حکم لاتے ہیں یا اسی جیسا لاتے ہیں۔ عام طور سے کلام و گفتگو میں بھی یہی طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ "انساء" جو ترک کے معنیٰ میں ہے اور "نسئی" جو تاخیر کے معنیٰ میں ہے دونوں کا مفہوم اس قرارت میں آجاتا ہے، اس لیئے کہ جو چیز متروک ہوتی ہے، چھوڑ دی جاتی ہے وہ لازمی طور پر جب تک وہ متروک ہے اس وقت تک کے لیئے مؤخر و ملتوی رہتی ہے۔

بعض حضرات نے "اَوْ نُنْسِهَا" کی قرارت پر، جب کہ اسے نسیان، رفع، بھولنے کے معنیٰ میں لیا جائے، اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی کوئی بھی ایسی آیت بھول جائیں جو منسوخ نہ ہوئی ہو۔ آیت "وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْ اَوْحَیْنَا اِلَیْكَ" (اور اگر ہم چاہیں تو جو وحی ہم نے آپ کی طرف کی ہے وہ سلب کرلیں) سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ذہن سے کوئی ایسی چیز، جس کا علم آپ کو وحی کے ذریعہ دے دیا، پھر نہیں بھلائی (کیونکہ آیت میں ہے کہ اگر ہم چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے، گویا ایسا کیا نہیں)۔ لیکن میرا خیال ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت احادیث اور آپ کے صحابہ کے اقوال سے اس اعتراض کی تردید ہوتی ہے۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبائل انصار کے ستّر صحابہ رضوان اللہ علیہم جنھوں نے بیر معونہ کے موقعہ پر شہادت پائی تھی، ان کے بارے میں قرآن مجید میں یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ "بَلِّغُوْا عَنَّا قَوْمَنَا اَنَّا لَقِیْنَا رَبَّنَا فَرَضِیَ عَنَّا وَاَرْضَانَا" (ہمارے بارے میں ہماری قوم (مسلمانوں) کو پہنچا دو کہ ہم اپنے رب سے آملے ہیں، پس اللہ ہم سے راضی ہے اور ہم اس سے راضی اور خوش ہیں)۔ پھر یہ آیت اٹھالی گئی۔

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قرآن مجید میں ہم یہ آیت پڑھتے تھے "لَوْ اَنَّ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِیَیْنِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغٰی لَهُمَا ثَالِثًا وَلَا یَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابُ وَیَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰی مَنْ تَابَ" (اگر ابن آدم کے پاس مال کی دو وادیاں ہوں تو تیسری وادی کی حرص میں لگا رہے گا، اور ابنِ آدم کے پیٹ کو مٹی کے سوا اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی، اور اللہ اس شخص کی توبہ قبول کرتا ہے جو توبہ کرے) پھر یہ آیت اٹھالی گئی۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی روایتیں ہیں کہ اگر ہم انھیں ذکر کرنے لگیں تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ عقلی طور پر بھی یہ کوئی غیر ممکن بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر جو کچھ نازل کیا ہے اس میں سے کوئی حکم (جو صرف ایک متعینہ مدت کے لیئے تھا، مدت پوری ہونے کے بعد) اسے اٹھالے اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن سے بھلا دے۔ آیت "اور اگر ہم چاہیں تو جو وحی ہم نے آپ

Marfat.com

کی طرف کی ہے وہ سلب کرلیں'' سے جو معترض نے استدلال کیا تھا وہ بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ آیت میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ اس میں سے کوئی جز بھی اٹھایا نہیں جائے گا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو جو کچھ آپ پر وحی کے ذریعہ نازل ہوا ہے وہ سب اٹھالے، لیکن ایسا ہوگا نہیں۔ البتہ وہ احکام اٹھا لیے گئے جو وقتی تھے اور جن کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ایک موقعہ پر ارشاد ہے ''سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ'' (ہم آپ کو قرآن پڑھا دیا کریں گے، پھر آپ اسے نہ بھولیں گے، ہاں البتہ اللہ ہی جو کچھ بھلا دینا چاہے) اس آیت میں یہی بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے متعلق مناسب سمجھتا ہے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن سے اسے بھلا دیتا ہے۔

آیت کی یہ تفسیر ہم نے اس کی ظاہری ترتیب کے پیشِ نظر کی ہے، ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ نسخ اور تبدیلی کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے پاس کوئی حکم محفوظ رکھا ہو۔[1]

''نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا'' (تو کوئی اس سے بہتر یا مثل دوسرا لے آتے ہیں)۔ علماء کے اس کی تفسیر کے سلسلے میں کئی اقوال ہیں۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ ''جو تمہارے لیے نفع کے اعتبار سے بہتر ہو اور سہل بھی ہو'' قتادہ نے فرمایا کہ ''وہ ایسا حکم ہوتا ہے کہ اس میں تخفیف ہوتی ہے، رحمت ہوتی ہے، حکم ہوتا ہے، نہی ہوتی ہے''

---

[1] جیسا کہ علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی تشریحات سے بھی واضح ہے کہ نسخ کا مفہوم شریعت میں بالکلیہ ازالہ یا تبدیلی کا نہیں ہے۔ اردو میں ایک لفظ منسوخی اسی سے لے کر استعمال ہوتا ہے اور نسخ اس کے ہم معنی نہیں ہے، اصطلاح شریعت میں اس کا استعمال اردو کی منسوخی سے بالکل مختلف معنی میں ہوتا ہے۔ اخبار و عقائد میں تو نسخ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ صرف احکام میں گنجائش ہے اور وہ بھی صرف زمانۂ نزولِ وحی تک محدود ہے۔ ایک حاذق طبیب، حالات، موسم اور خود مریض کی کیفیات کی رعایت سے اپنے نسخہ میں تبدیلی کرتا ہی رہتا ہے۔ انسان دانت اور جبڑے رکھتا ہے اور اس لیے ٹھوس اور سخت چیزیں بھی اس سے چبا کر نگل جاتا ہے، لیکن ایک شیرخوار بچہ ایسا نہیں کر سکتا، اس لیے اسے شربتی غذاؤں کی ضرورت ہوتی ہے، جوں جوں بچہ بڑھتا جاتا ہے آپ اس کی غذاؤں میں تبدیلی کرتے جاتے ہیں اور اس کی قابلیت و استعداد کے مطابق ٹھوس غذائیں دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ احکام میں نسخ کی بھی کچھ یہی کیفیت ہے۔ زمانہ نزولِ وحی کا تھا، اسلام کے ابتدائی زمانہ میں حالات کی مناسبت سے کچھ احکام نازل ہوئے، لیکن ہمیشہ کے لیے وہ اللہ کی نظر میں مناسب نہیں تھے، اس لیے منسوخ کر دیئے گئے۔ احکام کا نازل کرنے والا بھی موجود تھا اور جن پر احکام نازل ہو رہے تھے وہ بھی دنیا میں تھے، اس لیے اس تبدیلی میں کوئی ذہنی اشکال بھی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو تبدیلی اور نسخ ناگزیر تھا۔ خود اللہ تعالیٰ کے علم میں تمام حالات اور اس کی مناسبت سے احکام کے نزول کی ترتیب تھی، اس لیے نسخ اور تبدیلی تو صرف ہم بندوں کے اعتبار سے ہوئی، اللہ تعالیٰ کی نسبت سے تو یہ محض بیان و وضاحت کا حکم رکھتی ہے، کہ جو کچھ اللہ کے علم میں پہلے سے ہے اسے بندوں کے سامنے واضح کر دیا۔ علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے نسخ کے مسئلہ پر لکھا ہے کہ شریعت کا جو حکم بھی منسوخ ہوا تو بعد میں بھی کسی نہ کسی درجہ میں ضرور باقی رہا، ایسا نہیں ہوا کہ منسوخ ہونے کے بعد کسی درجہ میں بھی باقی نہ رہا ہو۔ مثلاً تہجد کی نماز پہلے فرض تھی، بعد میں فرضیت منسوخ ہو گئی لیکن اب بھی مطلوب و محبوب نوافل میں سے ہے۔ یہی حال دوسرے منسوخ احکام کا بھی ہے

بعض احکام کی فرضیت اور بعض چیزوں کی حرمت بھی رفتہ رفتہ کئی مرحلوں کے بعد نازل ہوئی۔ مثلاً شراب کی حرمت یا پردہ کا حکم ایک دم نازل نہیں ہوا، پوری ترتیب کے ساتھ کئی مرحلوں میں ایک کی حرمت اور دوسرے کے حکم کی جا کر کہیں تکمیل ہوئی ہے۔ اس ترتیب میں بھی نسخ کی معنویت پائی جاتی ہے۔ (مترجم)

Marfat.com

سدی نے فرمایا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ”جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں تو اس سے بہتر لاتے ہیں اور جسے منسوخ نہیں کرتے، بلکہ چھوڑ دیتے ہیں تو اسی جیسا حکم لاتے ہیں۔“ گویا اس تفسیر کی روشنی میں ”مِنْهَا“ کی ضمیر ”آيَةٍ“ کی طرف لوٹتی ہے اور ”مِثْلِهَا“ کی ضمیر کا تعلق ”نُنْسِهَا“ کی ضمیر سے ہے۔

عبید بن عمیر سے روایت ہے کہ ”ہم تمہارے پاس سے اسے اٹھا لیتے ہیں، پھر اسی جیسی کوئی آیت لاتے ہیں یا اس سے بہتر لاتے ہیں۔“ ربیع اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بعض تلامذہ سے بھی یہی معنی منقول ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی مناسب اور بہتر تفسیر یہ ہے کہ ”جس آیت کا بھی حکم ہم بدلتے ہیں اور اس میں تغیر کرتے ہیں یا اس کی تبدیلی کو چھوڑ دیتے ہیں اور اپنی حالت پر باقی رہنے دیتے ہیں تو پھر ہم منسوخ آیت کے حکم سے کوئی بہتر ہی حکم لے آتے ہیں (دنیاوی زندگی میں اس میں بہتری کی شکل یہ ہوتی ہے کہ مثلاً کوئی حکم پہلے فرض تھا اور پھر اس کی فرضیت ساقط کر دی گئی اور اس طرح بندوں سے ایک بار کو ہلکا کر دیا۔ جیسے قیام لیل (تہجد) ابتداء میں مسلمانوں پر فرض تھا، لیکن بعد میں اس کی فرضیت ساقط کر دی گئی، کیونکہ فرضیت کی صورت میں ہر شخص کے لیے ادا کرنا ضروری تھا جو لوگوں پر شاق گذرتا۔ (اُخروی بہتری اور منفعت کا خیال رکھتے ہوئے کسی حکم کے نسخ کی یہ صورت ہے کہ اگرچہ دنیا میں عمل کی مشقت اٹھانی پڑتی تھی، لیکن اس کا ثواب بہت زیادہ تھا، جیسے ابتداء اسلام میں سال بھر میں صرف چند دن (ایام معدودات) کے روزے فرض تھے، پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا اور اس کی جگہ سال بھر میں مکمل ایک مہینہ کا روزہ فرض ہوا، اگر مشقت اور عمل کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یقیناً مشقت زیادہ تھی، لیکن اس کا ثواب بھی بہت زیادہ ہے اور اللہ کے یہاں اس کی فضیلت بھی بہت ہے۔ یہی مطلب ہے ”نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا“ (تو ہم کوئی اس سے بہتر ہی لے آتے ہیں) کا، کیونکہ یا وہ بہتر ہو گا دنیاوی زندگی کے اعتبار سے اور رعایت اس میں دنیاوی کلفت و مشقت کی کی گئی ہو گی یا پھر وہ اخروی زندگی کے اعتبار سے بہتر ہو گا اور رعایت اُخروی ثواب و اجر کی کی گئی ہو گی)

دوسری صورت یہ تھی کہ منسوخ حکم کی جگہ پر جو حکم آیا ہے وہ اجر و ثواب میں بھی اور بدنی مشقت میں بھی پہلے جیسا ہو، جیسے نماز میں بیت المقدس کی طرف رخ کرنا پہلے فرض تھا، اسے منسوخ کر کے مسجد حرام کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا فرض قرار دیا گیا۔ یہاں بیت المقدس اور مسجد حرام اگرچہ دو مختلف سمتیں ہیں، لیکن دونوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے میں تعب و مشقت یکساں ہے اور اجر و ثواب بھی اس لیے یکساں ہے ”أَوْ مِثْلِهَا“ کا یہی مفہوم ہے۔ ”مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا“ کا مطلب یہ ہے کہ ہم جس آیت کا حکم تبدیل کرتے ہیں یا اسے چھوڑتے ہیں۔ یہاں اگرچہ حکم کا لفظوں میں ذکر نہیں ہے، لیکن لفظ ”آيَة“ سے خود ہی وہ سمجھا جا سکتا ہے، اس لیے صراحت کے ساتھ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی مختلف مثالیں ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ مثلاً آیت ہے ”وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ“ (اور ان کے دلوں میں گوسالہ پیوست ہو گیا ہے) مطلب ہے گوسالہ کی محبت۔ یہاں لفظ ”حب“ لفظوں میں ذکر نہیں، کیونکہ بغیر ذکر کے سمجھا جاتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ جب بھی ہم کسی حکم میں تبدیلی کرنا چاہتے اور اسے بدل دیتے ہیں، یا اس میں تبدیلی نہیں کرنا چاہتے اور اسے جوں کا توں باقی رکھتے ہیں تو ہم تمہارے لیے، اے مسلمانو! اس سے بہتر حکم لاتے ہیں یا ایسا حکم لاتے ہیں جو مشقت و سہولت اور اجر و ثواب میں اسی جیسا ہوتا ہے۔

”أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یعنی اے محمد! کیا آپ کو خبر نہیں کہ اپنے جو احکام میں نے بدل دیئے ہیں اس کے بدلہ میں آپ کو اور آپ کے ساتھی مومنین کو اس سے بہتر اور دین و دنیا میں اس سے زیادہ نفع بخش یا اسی جیسا حکم دینے پر میں قدرت رکھتا ہوں، یقیناً میں اس پر اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہوں۔ آیت میں ”قَدِيرٌ“ کے معنی قوی کے ہیں۔

Marfat.com

"أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ" (کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہی کے لیے سلطنت آسمانوں اور زمین کی ہے اور اللہ کے سوا کوئی تمہارا یار و مددگار نہیں)۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان چیزوں کا علم نہیں تھا کہ آپ کو بتائی گئیں۔ اس کے جواب میں بعض حضرات نے تو یہ کہا ہے کہ کلام عرب کے قاعدے کے مطابق خود اس آیت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ کو ان چیزوں کا پہلے سے علم تھا۔ بولتے ہیں "أَلَمْ أُكْرِمْكَ"، کیا میں نے تمہاری عزت و تکریم نہیں کی یعنی مخاطب کے علم میں پہلے ہی سے یہ بات ہے کہ اس کی تکریم کی گئی ہے اور جب اس سے یہ جملہ کہا جائے گا۔ یہی صورت آیت میں بھی ہے۔ لیکن یہ توجیہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ حرف استفہام (سوالیہ حرف، جو آیت کی ابتداء میں "أ" ہے) جب کسی جملہ پر داخل ہوتا ہے تو یا اس سے مقصود کسی بات کا ثبوت چاہنا اور پوچھنا ہوتا ہے یا نفی مقصود ہوتی ہے۔ اثبات کے معنی کے لیے حرف استفہام کلام عرب میں استعمال نہیں ہوتا، خاص طور سے جب حرف نفی (جو آیت میں "لَمْ" ہے) پر داخل ہو جب تو اس کی کوئی صورت ہی نہیں ہو سکتی (اور مذکورہ بالا توجیہ میں اسے اثبات ہی کے معنی میں لیا گیا ہے)

میرے نزدیک آیت کی توجیہ یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کیا گیا ہے، لیکن مراد ہیں آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ اور اس کی دلیل ہے "مَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ" اور اللہ کے سوا کوئی تمہارا یار و مددگار نہیں) اور اس کے بعد کی تین آیتیں، کہ ان میں صراحت کے ساتھ جمع کی ضمیر استعمال کی گئی ہے۔

کلام عرب میں خطاب کے موقعہ پر یہ طریقہ عام طور پر استعمال ہوتا ہے کہ متکلم کلام میں بظاہر خطاب بعض خاص افراد کو کرتا ہے، لیکن مراد دوسرے افراد ہوتے ہیں، کبھی الفاظ میں صرف ایک فرد کی گنجائش ہوتی ہے، لیکن اس کے واسطہ سے خطاب ہوتا ہے جماعت سے، اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔

ایک موقعہ پر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا گیا ہے "يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ" (اے نبی اللہ سے ڈرتے رہیے اور کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مانیے)۔ اس کے بعد ہے "وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا" (اور جو حکم آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے اسی کی پیروی کیجیے، اور تم لوگ جو کچھ کرتے رہتے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے) پہلے خطاب بظاہر واحد کے صیغہ کے ساتھ ہو رہا تھا، لیکن یک بیک جمع کا صیغہ استعمال ہوا۔ یہ طرز عربی اشعار میں بھی معروف و مشہور ہے اور فصیح و بلیغ سمجھا جاتا ہے "لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ"، (اللہ ہی کے لیے ہے سلطنت آسمان و زمین کی) یہاں "مِلْكُ السَّمٰوٰتِ"، نہیں کہا، کیونکہ کلام عرب میں "مُلْك" سے مراد سلطانی اور مملکت ہوتی ہے، اور اس کے لیے اہل عرب "مُلْكُ اللَّهِ"، استعمال کرتے ہیں، اس کے بالمقابل "مِلْك" صرف ملکیت اور قبضہ کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس کے لیے بولتے ہیں "مِلْكُ فُلَانٍ هٰذَا الشَّيْءَ" (فلاں اس چیز کا مالک ہے)۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ (اے محمد! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اور اس کی حکمرانی صرف میرے ہی لیے ہے، میرے سوا اور کسی کو یہ چیز حاصل نہیں، آسمان و زمین میں اور جو کچھ ان دونوں میں موجود ہے ان پر میں جس طرح چاہتا ہوں حکومت کرتا ہوں، جس چیز کا چاہتا ہوں حکم کرتا ہوں، جس چیز سے چاہتا ہوں روکتا ہوں، بندوں سے متعلق اپنے احکام میں جس طرح چاہتا ہوں تبدیلی اور نسخ کرتا ہوں اور جن احکام کو چاہتا ہوں باقی رکھتا ہوں۔ اس آیت میں اگرچہ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس سے یہودیوں کی بھی تکذیب ہو جاتی ہے جو تورات کے احکام میں نسخ کا انکار کرتے تھے اور اس لیے عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور محمد صلی اللہ

Marfat.com

علیہ وسلم کی نبوت کے بھی منکر تھے، کیونکہ یہ دونوں حضرات انبیاء اللہ کی طرف سے ایسے احکام لائے تھے جن سے توریت کے بہت سے احکام منسوخ ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں بتاتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی سلطانی اور فرماں روائی صرف اللہ کے لیے ہے، تمام مخلوقات اس کی مملکت و رعیت ہیں اور اس لیے جن چیزوں کا وہ حکم کرتا ہے اور جن سے روکتا ہے ان کی اطاعت سب کے لیے ضروری ہے۔ اسے حق ہے کہ اپنی مملکت میں جو حکم چاہے نافذ کرے جس سے چاہے روک دے، جو احکام چاہے منسوخ کر دے اور جنھیں چاہے باقی رکھے۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان مومنین سے فرماتا ہے جو آپ کے ساتھ تھے کہ میرے حکم کی اطاعت و فرمانبرداری کرو، جن احکام کو منسوخ کرکے میں دوسرا حکم لاتا ہوں ان میں بھی میری اطاعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو اور جن احکام کو باقی رکھتا ہوں ان میں بھی میری اطاعت کرو، اس سلسلے میں تمھیں کسی مخالفت کی پرواہ نہ ہونی چاہیئے، کیونکہ تمہارے تمام معاملات کو سدھارنے والا، تمہارا ولی اور تمہاری مدد کرنے والا میرے سوا اور کوئی نہیں ہے، میں اپنے غلبہ، اپنی سلطانی اور اپنی قوت سے تمہاری مدد اور تمہارا دفاع کروں گا اور آخر الامر تمہیں کو غالب کروں گا۔ "وَلِيٌّ" فَعِيلٌ کے وزن پر "وَلِيْتُ اَمْرَ فُلَانٍ" سے ماخوذ ہے یعنی میں فلاں کے معاملہ کا قیم ہوں، اب میں اس کے معاملات کی نگرانی اور دیکھ بھال کروں گا، مسلمانوں کے حکمرانِ اعلیٰ کے لیے بھی اسی سے "والی" استعمال ہوتا ہے۔ "نَصِيْرٌ" بمعنی مؤید و قوی ہے "مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ" یعنی اللہ کے سوا، اللہ کو چھوڑ کر، مطلب یہ ہے کہ اے مومنو! اللہ کو چھوڑ کر اس کے سوا تمہارا کوئی یار و مددگار نہیں جو تمہاری تائید کر سکے اور تمہارے دشمنوں کے خلاف تمہاری مدد کر سکے۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ

ہاں کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے دبے جا بے جا درخواستیں کرو جیسا کہ اس کے قبل حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے بھی (ایسی) درخواستیں کی جا چکی

وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ○

ہیں۔ اور جو شخص بجائے ایمان لانے کے کفر (کی باتیں) کرے بلا شک وہ شخص راہ راست سے دور جا پڑا

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ

ان اہل کتاب (یعنی یہود) میں سے بہتیرے دل سے یہ چاہتے ہیں کہ تم کو تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر کافر کر ڈالیں (اور خیر خواہی

كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ

سے نہیں بلکہ) محض حسد کی وجہ سے جو کہ خود ان کے دلوں ہی سے (جوش مارتا) ہے حق واضح ہوئے پیچھے

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى

پھر (اب تو) معاف کرو اور درگذر دو جب تک حق تعالیٰ (اس معاملہ کے متعلق) اپنا حکم (قانون جدید) بھیجیں بلا شک اللہ تعالیٰ ہر

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

چیز پر قادر ہیں۔

تنبیہ

"اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ" (تم شاید یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے سوال کر ڈالو
جیساکہ اس کے قبل موسیٰ سے سوال کیئے جاچکے)۔ اس آیت کے شانِ نزول کے سلسلہ میں کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔ ابن
عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رافع بن حریملہ اور وہب بن زید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا تھا کہ ہمارے لیے
آسمان سے کوئی کتاب اتار دیئے جسے ہم بھی پڑھ سکیں اور ہمیں نہریں تیار کر کے دیجیئے تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں۔ اس پر یہ آیت نازل
ہوئی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے تو موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں اللہ کو علانیہ دکھا دیجیئے، آں حضورؐ سے قریش نے
بھی یہی مطالبہ کیا تھا کہ اللہ ان کے پاس آئے اور وہ علانیہ طور پر اسے دیکھ لیں پھر ایمان لے آئیں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ
قول قتادہ اور سدی رحمہا اللہ سے نقل ہوا ہے۔
مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ قریش نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا تھا کہ صفا پہاڑی ان کے لئے سونے
کی بنادی جائے۔ آں حضورؐ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، اللہ تمہارے لیئے ایسا بھی کر دے گا، لیکن اگر پھر بھی تم نے کفر کیا تو وہ تمہارے
لیئے بنی اسرائیل کا مائدہ (خوان) ثابت ہوگا (اور تم پر بھی عذاب الٰہی آجائیگا)۔ اس پر وہ پھر گئے اور انکار کرنے لگے پھر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت نازل کی
ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس سلسلے میں روایت ہے کہ ایک صاحب نے عرض کی، یا رسول اللہ! کاش، ہمارے لیئے بھی کفارے
بنی اسرائیل کے کفاروں کی طرح ہو جاتے! اس پر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اے اللہ! ہم یہ نہیں چاہتے! ۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں
جو کچھ دیا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو اس نے بنی اسرائیل کو دیا تھا، اگر بنی اسرائیل کا کوئی فرد کوئی گناہ کرتا تو گناہ اور اس کے ساتھ اس کا کفارہ
اپنے دروازہ پر لکھا ہوا پاتا تھا .... اب اگر کفارہ ادا کرتا تو دنیا میں اس کی رسوائی ہوتی اور اگر نہ ادا کرتا
تو آخرت میں پکڑ ہوتی۔ اللہ نے خیر و بھلائی تمھیں اس سے کہیں زیادہ دی ہے جتنی بنی اسرائیل کو دی تھی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "جو
کوئی گناہ کرے گا یا اپنے اوپر ظلم کرے گا اور پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے گا تو وہ اللہ کو مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا پائے گا"
بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پانچوں وقت کی نمازیں اور ایک جمعہ کی ادائیگی دوسرے جمعہ کی نماز کی ادائیگی
تک (ہفتہ بھر کی) خطاؤں اور گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہیں۔ فرمایا کہ جب بندہ ایک نیکی کا ارادہ کرلے لیکن اسے عملی جامہ نہ پہنا سکے تو
اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھی جاتی ہے، اور اگر ارادہ کے بعد اس کے مطابق عمل بھی کر لیا تو دس گنا ثواب اس کے نامۂ اعمال
میں لکھا جاتا ہے، اس واقعہ پر اللہ تعالیٰ نے مذکورۂ بالا آیت نازل کی۔
آیت میں کلمہ "اَمْ" کے متعلق علماء نحو کے کئی اقوال نقل ہوئے ہیں، لیکن میرے نزدیک یہ استفہام مبتداء ہے اور آیت کا مطلب
یہ ہے کہ "اے قوم کے لوگو! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے بھی اسی طرح کی چیزوں کا سوال کرو جیساکہ تم سے پہلے موسیٰ علیہ السلام
کی قوم نے ان سے سوال کیا تھا اور اگر بالغرض اللہ کی حکمت و مصلحت تمہارے مطالبہ کو پورا کرنے کی نہ ہوئی تو تم اسی کو بہانا بنا کر کفر کرنے
لگو، یا اگر اللہ کی حکمت و مصلحت تمہارے مطالبہ کو پورا کرنے کی ہوئی اور اس نے تمہارا مطالبہ پورا بھی کر دیا، لیکن حسب عادت تم اب
بھی کفر و انکار کرتے رہے تو کیا تم چاہتے ہو کہ تم بھی پچھلی قوموں کی طرح ہلاک کر دیئے جاؤ، کیونکہ اللہ کی سنت یہی ہے کہ جب قومیں
اپنے رسول سے مافوق الفطرت چیزوں کا مطالبہ کرتی ہیں اور ان کا مطالبہ پورا کر دیا جاتا ہے، لیکن پھر بھی وہ کفر سے باز نہیں آتیں
تو ان پر بلا تاخیر اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے۔
"وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ" (اور جو کوئی ایمان کے بدلہ میں کفر اختیار کرلے گا) کفر سے مراد اللہ اور اس کی نشانیوں
کا انکار اور ایمان سے مراد اللہ اور اس کی نشانیوں کی تصدیق اور اقرار ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت میں کفر سے مراد شدت

اور ایمان سے مراد نرمی ہے۔ کفر کا مفہوم شدت اور ایمان کا مفہوم نرمی میرے علم میں نہیں ہے۔ ممکن ہے جنھوں نے یہ معنی لیے ہیں ان کے نزدیک کفار کے لیے آخرت کے شدائد اور تکلیفیں مراد ہوں اور مومنین کے لیے آخرت کی نعمتیں اور سہولتیں مراد ہوں۔ یہ ایک توجیہ ہو سکتی ہے، اگرچہ یہ بھی آیت کے ظاہری خطاب سے بہت بعید ہے۔ یہ قول ابوالعالیہ سے نقل ہوا ہے۔ اس آیت میں واضح دلیل موجود ہے کہ "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا" سے یہاں تک تمام آیات میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضؓ کو ہے اور ان کے اس عمل پر عتاب ہے جسے یہودی اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے (یعنی قول "راعنا") لیکن آں حضورؐ اسے پسند نہیں کرتے تھے اور اللہ بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اس لیے اللہ نے مسلمانوں کو بتایا کہ یہودی ان کی طرف سے اپنے دل میں کینہ اور حسد رکھتے ہیں اور جس طرح بھی ہو سکے ان کا برا ہی چاہتے رہتے ہیں مسلمانوں کو اس سے بھی اللہ تعالیٰ روکتا ہے کہ انھیں اپنا خیرخواہ سمجھیں اور اگر وہ خیرخواہی کا بظاہر اظہار کریں تو اس سے ہوشیار رہیں۔

پھر ارشاد ہے کہ اور جو کوئی ایمان کے بدلہ میں کفر اختیار کرلے گا تو وہ سیدھی راہ سے بھٹک جائے گا "فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ" (سو وہ یقیناً سیدھی راہ سے بھٹک گیا)۔ "ضَلَّ" بمعنی ذَهَبَ، حَادَ (گیا، ہٹ گیا) آتا ہے۔ "ضلال" اپنے اصلی مفہوم کے اعتبار سے بھٹک جانے اور ہٹ جانے کے معنی میں ہی آتا ہے۔ پھر ہر چیز جو گمنام ہو جائے اور اس کی طرف سے توجہ ختم ہو جائے اس کے لیے بھی اس کا استعمال ہونے لگا۔ ایسے شخص کو جو گمنام ہو جسے کوئی پوچھتا بھی نہ ہو، اہل عرب "ضَلُّ بْنُ ضَلٍّ" یا "قُلُّ بْنُ قُلٍّ" کہتے تھے۔ "فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ سیدھی راہ سے ہٹ گیا۔ "سَوَآءَ السَّبِیْلِ" میں "سواء" سے مراد قصد و منہج لیا ہے۔ "سواء" کا اصل معنی وسط ہے۔ "سبیل" بمعنی چالو راستہ۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کے بدلہ میں کفر اختیار کرلے گا اور اپنے دین سے پھر جائے گا تو یقیناً وہ سیدھے اور درمیانی راستے سے بھٹک گیا ہے۔ آیت میں "سَوَآءَ السَّبِیْلِ" وہی سیدھا راستہ، صراطِ مستقیم ہے جس کی طرف ہدایت کی دعا مانگتے رہنے کا اس ارشاد میں ہمیں حکم ہوا ہے "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ" (ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت کیجیے، ان لوگوں کے راستہ کی جن پر آپ نے انعام کیا ہے)۔

حسد کی کارفرمائی

"وَدَّ كَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِكُمْ كُفَّارًا" (بہت سے اہل کتاب تو دل سے چاہتے ہیں کہ تمھیں ایمان لے آنے کے بعد پھر سے کافر بنالیں)۔ اس آیت سے تو یہ بات صاف ہو گئی کہ "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا" سے یہاں تک تمام آیات میں خطاب صحابہ سے ہے۔ اگرچہ کئی آیات میں بظاہر خطاب آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا ہے، لیکن درحقیقت ان میں بھی خطاب مومنین اور آپ کے صحابہ ہی کو ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عتاب ہے اور اپنے دینی معاملات میں یہودیوں اور ان کے مشرک بھائیوں کی کسی قسم کی نصیحت قبول کرنے اور ان کی رائے پر عمل کرنے کی ممانعت ہے جن حضرات صحابہ نے غلطی سے یہودیوں سے سن کر ایسا لفظ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں استعمال کیا جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ "اپنے نبی سے یہودیوں کی طرح "راعنا" نہ کہو، بلکہ "انظرنا" کہو اور غور سے سنو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دینا، میرا کفر کرنا اور میرے اس حق کا انکار کرنا ہے جو میں نے تم پر ان کی تعظیم و توقیر کے سلسلے میں ضروری قرار دیا ہے اور جو شخص میرا کفر کرتا ہے اسے دردناک عذاب کی سزا ملتی ہے، کیونکہ یہودی اور مشرکین دل سے چاہتے ہیں کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے کوئی خیر نازل نہ ہو، بلکہ ان میں بہت سوں کی تو دلی خواہش یہ ہے کہ تمھیں ایمان لے آنے کے بعد پھر سے کافر بنالیں، ان کی یہ خواہش صرف حسد کی وجہ سے ہے جو ان کے دلوں میں تمہارے اور تمہارے نبی کی

Marfat.com

طرف سے چھپا ہوا ہے، اور یہی اس کے بعد کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں ان پر حق واضح ہو چکا ہے اور انھیں خوب معلوم ہے کہ آپ ان کے بھی نبی ہیں اور تمام دنیا کے لیے بھی نبی ہیں۔

زہری سے روایت ہے کہ آیت میں اشارہ مشہور یہودی کعب بن اشرف کی طرف ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حی بن اخطب اور ابو یاسر بن اخطب کی طرف اشارہ ہے جو تمام یہودیوں میں عربوں سے سب سے زیادہ اس وجہ سے حسد رکھتے تھے کہ آخری نبی عربوں میں کیوں پیدا ہوئے اور ہر وقت اس تگ و دو میں لگے رہتے تھے کہ کس طرح لوگوں کو آں حضور ص کے خلاف بھڑکایا جائے اور آپ کے خلاف ذہن تیار کیا جائے۔ انھیں کے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے۔ "حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ" یعنی بہت سے اہل کتاب جو یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ایمان سے پھیر کر پھر سے کافر بنالیں تو یہ محض وہ حسد کی وجہ سے جو ان کے نفسوں میں ہے۔" آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اہل کتاب کے تم سے حسد کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے تمھیں توفیق دی ہے تمھیں اپنے دین اور اپنے رسول پر ایمان کی طرف ہدایت دی ہے اور تمھیں یہ خصوصیت بخشی ہے کہ تمہاری طرف بھیجے جانے والے رسول تمہارے ہی ایک فرد ہیں اور تم پر بہت زیادہ مہربان ہیں۔ وہ حسد اس لیے کرتے ہیں کہ رسول ان میں سے کیوں نہیں مبعوث ہوا۔ "مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ" کا مفہوم یہ ہے کہ خود اپنے ہی نفس اور اپنی ہی طرف سے وہ ایسا کرتے ہیں۔

ابن ابی جعفر سے روایت ہے کہ "مومنین کے بارے میں ان کی یہ دلی خواہش خود ان کے نفسوں میں تھی یعنی اس کا انھیں ان کی کتاب میں کوئی حکم نہیں ہوا تھا، بلکہ یہ جانتے ہوئے وہ ایسا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ان باتوں سے روکا ہے۔"

"مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ" (بعد اس کے کہ حق ان پر واضح ہو چکا ہے) یعنی اہل کتاب کے یہ افراد جو چاہتے ہیں کہ تمھیں تمہارے ایمان لے آنے کے بعد پھر سے کافر بنالیں، وہ یہ سب کچھ اس کے بعد کر رہے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کے متعلق ان پر حق واضح ہو چکا ہے۔

سلہ عام طور سے مفسرین نے اہل کتاب سے مراد یہودی یا یہودیوں کے علماء لیے ہیں، اور بعض حضرات نے چند یہودی سرغنہ کے نام بھی لیے ہیں جو اسلام کے خلاف سرگرمیوں کی قیادت کرتے تھے اور اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کو ان کے دین سے پھیر لیا جائے یا اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو کم از کم بدظن و بدگمان ہی کر دیا جائے۔ چونکہ مدینہ میں اہل کتاب میں سے یہودی ہی رہتے تھے اور وہی اس طرح کی سرگرمیوں میں حصہ بھی لیتے تھے۔ اس لیے یہی قرین قیاس بھی ہے کہ اہل کتاب سے مراد یہودی ہی ہوں لیکن آیت عام ہے اور یہود و نصاریٰ دونوں اس میں آسکتے ہیں۔ آج کل نصاریٰ کی طرف سے جو زبردست اور منظم پروپیگنڈہ عقائد اسلام کے خلاف تاریخی، سیاسی اور معاشرتی ہر محاذ سے اسلامی آبادیوں میں کیا جا رہا ہے اور جس کے لیے کروڑوں اربوں روپیہ صرف کیا جاتا ہے، اس کے پیش نظر کون کہہ سکتا ہے کہ نصاریٰ بھی اس آیت کے مصداق نہیں ہیں۔ نصاریٰ کے پاس جو زبردست اور منظم مشنری نظام ہے اس نے عوامی سطح پر اور یہودی اور عیسائی مستشرقین علماء کا ایک طبقہ علمی سطح پر جس تنظیم کے ساتھ اسلامی عقائد و نظریات کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے ہے وہ ہر حساس مسلمان کے لیے چیلنج ہے۔ ان کی سب سے آخری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اگر مسلمانوں کو ان کے دین سے پھیر نہیں سکتے تو ان کے دل میں ان کے دین کی طرف سے کچھ شبہات ہی ڈال دیں۔ خاص طور سے مستشرقین کا یہ طبقہ اس سلسلے میں سب سے بڑا فتنہ ہے، کیونکہ انھیں اہل علم سمجھ کر پڑھے لکھے مسلمان ان کی باتوں کو قابل توجہ سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اسلامی عقائد و نظریات کے متعلق ساری باتیں صحیح صحیح نقل کرتے جاتے ہیں، لیکن کہیں کہیں بیچ میں ایسا شوشہ چھوڑ دیتے ہیں کہ ذہن غیر شعوری طور پر اسے بھی قبول کر لے اور اس کے بعد دینی عقائد و اعمال کے متعلق شکوک و شبہات کا ایک طوفان ذہن میں امڈ آئے۔ بہرحال آیت کے عموم میں نصاریٰ بھی آسکتے ہیں، جنھوں نے نزول وحی کے وقت گو زیادہ نہ سہی، لیکن اس کے بعد ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منظم کوششیں کی ہیں۔ (مترجم)

Marfat.com

ابوالعالیہ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ "ان پر واضح ہو چکا تھا کہ محمدؐ واقعی اللہ کے رسول ہیں، وہ آپ کے متعلق تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے تھے۔" قتادہ، ربیع، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ محض اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ عناد میں یہ سب کچھ کرتے تھے، ورنہ اس سے وہ پوری طرح باخبر تھے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ محض افترا اور جھوٹ ہے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ بات نہیں تھی کہ یہ لوگ کسی چیز سے ناواقف تھے، انھیں ساری باتوں کا علم تھا لیکن حسد نے انھیں کفر و انکار پر آمادہ کیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں شرم دلائی اور خوب ملامت کی۔

عفو و درگذر کا حکم

"فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ" (پس معاف کرتے رہو تاآنکہ اللہ اپنا حکم بھیج دے) یعنی یہ یہودی تمہارے معاملہ میں جو غلط روی اختیار کیے ہوئے ہیں، تمھیں تمہارے دین سے پھیرنے کی کوششیں جس طرح یہ کرتے رہتے ہیں اور جس طرح انھوں نے تمہارے نبی کی مجلس میں محض تمہارے دین میں رخنہ ڈالنے کی غرض سے ایک نازیبا کلمہ (رَاعِنَا) کا استعمال شروع کیا تھا اور غلطی کی وجہ سے تم بھی اس میں مبتلا ہو گئے تھے، تو ابھی ان کی ان تمام حرکتوں کو معاف کرتے جاؤ، اللہ تعالیٰ ان کی سزا کے لیے خود اپنا حکم بھیجدے گا، پھر تمہارے لیے بھی کوئی صورت نکل آئے گی، اور ان کا بھی فیصلہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بعد میں ان کے متعلق جو فیصلہ کیا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنے نبی اور مومنین کو قرآن مجید میں حکم دیا کہ:۔ "اہل کتاب میں سے ان سے لڑو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ روز آخرت پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنھیں اللہ نے اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اور نہ سچے دین کو قبول کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں رعیت ہو کر اور اپنی پستی کا اقرار کر کے"، آیت کے اس حکم کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے عفو و درگذر کا حکم منسوخ کر دیا اور مسلمانوں پر ان سے قتال کو فرض قرار دیا، تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور یا وہ اسلام قبول کریں یا اگر اسلام قبول کرنے سے انکار ہے تو پھر ذلیل ہو کر جزیہ دینا قبول کریں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ، ربیع اور سدی رحمہم اللہ سے اسی کے مطابق تفسیر منقول ہے[1]۔ "اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"، یعنی بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، جن اہل کتاب کا ذکر ہو رہا ہے اور ان کے علاوہ دوسرے تمام ان کے بھائی بند، ان سب پر اللہ قادر ہے، اگر چاہے تو ان سے انتقام لے اور چاہے تو تمہاری طرح انھیں بھی ایمان کی توفیق دیدے، وہ کسی چیز سے معذور و بے بس نہیں، جو چاہتا ہے کرتا ہے، خلق و امر سب کچھ اسی کے قبضہ و قدرت میں ہے[2]۔ "قدیر" کا مفہوم پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ قوی کے معنی میں ہے۔

---

[1] حکم قتال اس وقت تک نازل نہیں ہوا تھا۔ آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ عنقریب نازل ہونے والا ہے۔ یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے مسلمانوں میں بھی چونکہ اشتعال تھا، اس لیے انھیں فی الحال صبر کی تلقین کی گئی۔ [2] یعنی اللہ کو قدرت ہر چیز پر ہے، خلق و امر اسی کے ہاتھ میں ہے، اپنی اسی قدرت سے اس نے بندوں کو بھی تھوڑا سا اختیار دیا ہے، اچھے بُرے کی تمیز دی، راستے بنائے ہیں تو اس کی بھی نشان دہی کر دی ہے کہ کون راستہ اچھا ہے اور کون بُرا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے کیا ہے۔ یہ اللہ کا قانون ہے اور اسی لیے بندے، جب برا راستہ اختیار کرتے ہیں تو سزا پاتے ہیں اور اچھا راستہ اختیار کرتے ہیں تو ثواب پاتے ہیں۔ اس سے اللہ کی قدرت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ یہ بھی اس کی قدرت ہی کا ایک کرشمہ ہے۔ انسان دو ٹانگوں پر کھڑا رہتا ہے، ایک ٹانگ پر بھی وہ کھڑا ہو سکتا ہے لیکن وہ اپنی دونوں ٹانگیں اٹھا کر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اللہ کی تقدیر کو اس سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک ٹانگ اٹھا کر کھڑے رہ جانے کی قدرت اللہ نے بندے کو دی ہے، لیکن اس کے بعد وہ مجبور ہے، اسے اتنی قدرت نہیں ہے کہ بلا کسی سہارے کے دونوں ٹانگیں اٹھا کر سیدھا کھڑا ہو سکے۔ گویا یہاں سے "جبر" کی حد شروع ہو جاتی ہے، عام زندگی میں بھی اس کا مشاہدہ ہو سکتا ہے انسان ایک حد تک اشیاء پر قدرت رکھتا ہے، لیکن آج اتنی ترقیات کے بعد بھی اس کی قدرت پر اکثر بے بسی کو بھی ہنسی آجاتی ہے۔ دنیا میں (باقی نمبر ۳۷)

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ

اور (سردست صرف) نمازیں پابندی سے پڑھے جاؤ اور زکوٰۃ دیئے جاؤ۔ اور جو نیک کام بھی اپنی بھلائی کے واسطے جمع کرتے رہو گے حق تعالیٰ

تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝

کے پاس (پہنچ کر) اُس کو پاؤ گے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ تمہارے سب کیئے ہوئے کاموں کو دیکھ بھال رہے ہیں۔

مسلمانوں کو خصوصی حکم

"وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ" (اور نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جو کچھ بھلائی تم اپنے واسطے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے پاس پاؤ گے) "اقامت صلوٰۃ" کا مفہوم ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس کا معنی نماز کو اس کے تمام حدود و آداب کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ اسی طرح "صلاۃ" اور "ایتاء زکوٰۃ" کا مفہوم بھی تمام تفصیلات کے ساتھ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ "وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ" کا مطلب یہ ہے کہ جو عمل صالح بھی تم اپنی زندگی میں کرو گے اور اپنی وفات سے پہلے پہلے جو اعمالِ خیر بھی تم اپنے لیئے ذخیرے کے طور پر آگے بھیجو گے، اس کا ثواب قیامت کے دن تم اپنے رب کے پاس پاؤ گے، وہ تمہیں تمہارے تمام اعمال کا بدلہ دے گا۔ "خَیْرٍ" سے مراد وہ عمل ہے جس سے اللہ خوش اور راضی ہوتا ہے۔ "تَجِدُوْهُ" کا مفہوم یہ ہے کہ تم اس کا ثواب پاؤ گے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح روایت ہے۔ عام طور سے محاورۂ زبان میں اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔

اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نماز قائم کرنے، زکات ادا کرتے رہنے اور دوسرے اعمالِ خیر کا حکم خاص طور سے اس لیئے دیا ہے کہ جو لغزش مسلمانوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرنے میں پہلے ہو چکی ہے کہ انھوں نے بھی یہودیوں کی طرح آنحضور کو خطاب "رَاعِنَا" کے لفظ سے کرنا شروع کر دیا تھا، اس کا ان اعمالِ خیر سے کفارہ ہو جائے، کیونکہ نماز قائم کرنا گناہوں کے لیئے کفارہ ہے، زکوٰۃ کی ادائیگی سے نفس اور بدن گناہ کی آلودگیوں سے پاک و صاف ہوتے ہیں اور عمومی طور پر اعمالِ خیر کی ادائیگی اللہ کی رضا اور خوشنودی اور اس طرح فوز و فلاح کا ذریعہ ہے

"اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ" (یقیناً تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اس کا خوب دیکھنے والا ہے)۔ اس آیت میں مخاطب مؤمنین کو اطلاع ہے کہ جب بھی وہ کوئی اچھا یا برا عمل کریں گے، خواہ چھپ کر ہو یا علانیہ وہ اللہ سے ہرگز پوشیدہ نہ رہ سکے گا اور اگر وہ عمل اچھا ہوا تو اچھا بدلہ ملے گا اور اگر برا ہوا تو برا بدلہ ملے گا۔ اگرچہ بظاہر آیت میں خبر و اطلاع دی گئی ہے، لیکن حقیقت میں یہ وعدہ وعید اور امر و زجر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قوم کو بتایا ہے کہ اللہ ہر کھلی اور پوشیدہ بات سے واقف ہے، تاکہ اس کی طاعت میں پوری کوشش کریں اور اس کی معصیت سے بچتے رہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ کَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ تِلْکَ

اور یہود اور نصاریٰ (یوں) کہتے ہیں کہ بہشت میں ہرگز کوئی نہ جانے پاوے گا بجز ان لوگوں کے جو یہودی ہوں یا اُن لوگوں کے جو نصرانی ہوں یہ (خالی دل بہلانے)

(بقیہ حاشیہ ۳۶) اللہ کا یہ انعام خود ہماری رہنمائی اس طرف کرتا ہے کہ ہم مجبور بھی ہیں اور مختار بھی ہیں اور ہمیں جو کچھ جزاء و سزا ملتی ہے وہ انھیں افعال پر ملتی ہے جن میں ہمیں اختیار حاصل ہے۔ (مترجم)

Marfat.com

أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ بَلَىٰ

کی باتیں ہیں۔ آپ (اُن سے یہ تو) کہیے کہ (اچھا) اپنی دلیل لاؤ اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو ضرور دوسرے

مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ

لوگ جاویں گے (کیونکہ) جو کوئی شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے شخص کو اُس کا عوض ملتا ہے پروردگار کے

ع ۹ ۱۳ ۱۳ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَقَالَتِ

پاس (پہنچ کر) اور نہ ایسے لوگوں پر (قیامت میں) کوئی اندیشہ ہے اور نہ ایسے لوگ (اس روز) مغموم ہونے والے ہیں اور یہود کہنے

الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ

لگے کہ نصاریٰ (کا مذہب) کسی بنیاد پر (قائم) نہیں اور (اسی طرح) نصاریٰ کہنے لگے کہ یہود کسی

الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ

بنیاد پر نہیں۔ حالانکہ یہ سب (لوگ آسمانی) کتابیں (بھی) پڑھتے (پڑھاتے) ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ (بھی) جو کہ (محض) بے علم ہیں

لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا

ان کا سا قول کہنے لگے سو اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان (عملی) فیصلہ کر دیں گے قیامت کے روز ان تمام

كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝

(مقدمات) میں جن میں وہ باہم اختلاف کر رہے تھے

بے بنیاد دعویٰ

"وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ" (اور یہ کہتے ہیں کہ جنت میں ہرگز کوئی داخل نہ ہوگا مگر ہاں وہی جو یہودی یا نصرانی ہوں، یہ ان کی نری آرزوئیں ہیں) مطلب یہ ہے کہ یہودی تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جنت میں یہودیوں کے سوا اور کوئی نہیں جائے گا۔ اور نصاریٰ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جنت میں نصرانیوں کے سوا اور کوئی نہیں جائے گا۔ یہ دعویٰ دونوں فرقے ایک دوسرے کے مقابلہ میں کیا کرتے تھے، چوں کہ بات جانی پہچانی تھی، اس لیے دونوں کے دعوؤں کو ایک ساتھ بیان کر دیا ہے۔ "هُودًا" کو بعض حضرات نے "هَائِدٌ" کی جمع بتایا ہے۔ جیسے عوط، عائط کی اور عوذ، عائذ کی جمع آتی ہے۔ اس وزن پر جمع مذکر و مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ "هَائِدٌ" کے معنیٰ توبہ کرنے والا، حق کی طرف لوٹنے والا" ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ "هُودٌ" مصدر ہے اور جمع کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، جیسے رَجُلٌ صَوْمٌ، قَوْمٌ صَوْمٌ، نِسْوَةٌ صَوْمٌ، میں "صَوْمٌ" مصدر ہے، لیکن واحد، جمع اور مؤنث سب کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت میں "إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا" اصل میں "إِلَّا مَنْ كَانَ يَهُودِيًّا" تھا، عربی قاعدہ کے مطابق اس لفظ میں حذف و اختصار

Marfat.com

رضی اللہ عنہ کی ایک قراءت بھی "اِلَّا مَنْ کَانَ ...... اُبَیّ ...... اس سلسلے میں ہوگیا ہے۔ "ھُوْدًا" سے کام لیا گیا جس سے وہ "یَھُوْدِیًّا اَوْ نَصْرَانِیًّا" نقل کی گئی ہے۔ "نَصَارٰی" کے متعلق تفصیلی بحث ہم پہلے کر چکے ہیں۔ "تِلْكَ اَمَانِیُّھُمْ" انھیں مذکورہ دونوں طبقوں کے متعلق اطلاع ہے کہ "یہ تو ان کی نری آرزوئیں ہیں جو بغیر کسی دلیل و حجت کے وہ اللہ سے قائم رکھتے ہیں، یقین انھیں خود بھی اس دعوی کی صحت پر نہیں حاصل ہے۔ قتادہ اور ربیع رحمہما اللہ سے اسی طرح تفسیر نقل ہوئی ہے "قُلْ ھَاتُوْا بُرْھَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ" (آپ کہہ دیجئے کہ اپنی سند لاؤ اگر تم سچے ہو) اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ یہود و نصاریٰ جو صرف اپنے لیے جنت کے استحقاق کا دعویٰ کرتے ہیں تو اے محمد! آپ ان سے کہیئے کہ اگر تم واقعی اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو تو اس کی سند و برہان لاؤ، تاکہ ہم بھی مان لیں کہ ہاں، واقعی جنت میں صرف یہودی ہی داخل ہوں گے، یا صرف نصاریٰ ہی داخل ہوں گے۔ "بُرْھَان" بمعنی وضاحت، سند اور دلیل ہے۔ قتادہ، سدی، مجاہد اور ربیع رحمہما اللہ سے یہ معنی منقول ہے۔ آیت بظاہر تو یہود و نصاریٰ سے ان کے دعویٰ پر دلیل و حجت کا مطالبہ کرتی ہے، لیکن حقیقت میں یہ اللہ کی طرف سے ان کے دعویٰ کی تردید و تکذیب بھی ہے، کیونکہ یہ طے تھا کہ ان کے پاس کوئی دلیل و حجت نہیں ہے اور وہ اسے ثابت کرنے پر ہرگز قادر نہیں ہیں۔ آگے کی آیت "بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَهٗ لِلّٰهِ" سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہود و نصاریٰ کی تکذیب و تردید ہی مقصود ہے۔ "ھَاتُوْا بُرْھَانَكُمْ" یعنی اپنی دلیل و سند لاؤ۔

صحیح قانون نجات

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَهٗ لِلّٰهِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔" یعنی جیسا کہ یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ جنت میں صرف یہی جائیں گے حقیقت یہ نہیں ہے "بلکہ جو کوئی بھی اپنی ذات کو اللہ کے آگے جھکائے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے کے لیے اس کے پروردگار کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔" مطلب یہ ہے کہ ان کا دعویٰ غلط ہے، بلکہ جنت میں وہ داخل ہوگا جو اخلاص کے ساتھ اپنی ذات کو اللہ کے آگے جھکائے گا۔ اللہ کے انعام و اکرام کا مستحق تو ایسا ہی شخص ہو سکتا ہے۔ سدی سے اسی کے مطابق تفسیر نقل ہوئی ہے۔ "اَسْلَمَ وَجْھَهٗ" کا مفہوم ہے "اللہ کی طاعت میں تذلل اور اس کی تقدیر پر یقین کامل۔"

"اسلام" "استسلام" سے نکلا ہے، خضوع اور عاجزی کے ساتھ جھکنے کے معنی میں آتا ہے۔ "مسلم" نام پڑنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ اپنے تمام اعضاء سے خضوع و عاجزی کے ساتھ اپنے رب کی طاعت کرتا ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے بھی "اَسْلَمَ وَجْھَهٗ" کا مطلب اللہ کے لیے اخلاص نقل ہوا ہے۔ "اَسْلَمَ" کے ساتھ صرف "وَجْه" (یعنی چہرہ) کا ذکر کیا، حالانکہ اللہ کی طاعت تمام ہی اعضاء انسانی سے مطلوب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ چہرہ (وجہ) انسان کے تمام اعضاء و جوارح میں سب سے اکرم و اشرف اور عزت و حرمت کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر سمجھا جاتا ہے، اس لیے جب کسی چیز کے سامنے ایک انسان کا چہرہ جھک گیا تو دوسرے اعضاء کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے، وہ بھی لازمی طور پر جھکیں گے۔ چنانچہ اہل عرب جب کسی چیز کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں تو اس کی طرف "وجہ" کی نسبت کر کے کہتے ہیں اور اس سے صرف چہرہ نہیں، بلکہ وہی چیز مراد لیتے ہیں۔ کلام عرب میں عام طور سے اس طرح استعمال ہوتا ہے اس کی وجہ یہی ہو کہ کسی چیز کا حسن و قبح چہرہ سے پہچان لیا جاتا ہے۔ اس لیے "مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَهٗ لِلّٰهِ" کا مطلب یہ ہوگا کہ جس نے اپنی ذات اور اپنے تمام اعضاء جسم کو اللہ کی طاعت میں جھکا دیا اور وہ اپنے اس عمل میں مخلص بھی ہو تو اسے اس کا اجر اس کے رب کے پاس ملے گا۔ "وَھُوَ مُحْسِنٌ" یعنی درانحالیکہ اپنے اس خضوع اور عاجزی میں وہ مخلص بھی ہو "فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ"، یعنی اللہ کی

Marfat.com

طاعت میں اخلاص کے ساتھ جھکنے والے کو اس کی طاعت پر اجر و ثواب اس کے رب کے پاس ملے گا اور ان اطاعت گذار اور مخلص بندوں کو آخرت میں اللہ کے عذاب کا کوئی خوف و اندیشہ نہ ہوگا اور جو کچھ وہ دنیا میں چھوڑ آئے ہیں اس پر انھیں کوئی غم بھی نہ ہوگا، کیونکہ ان نعمتوں کو وہ خود ہی دیکھ لیں گے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے طاعت گذار بندوں کے لیے تیار کر رکھی ہیں۔

فتنہ انگیزی

"وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ" (اور یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی بنیاد پر نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کسی بنیاد پر نہیں، حالانکہ وہ سب ایک ہی کتاب پڑھتے ہیں)۔ اہلِ کتاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آپس ہی میں تکرار شروع کر دی تھی اور یہ آیت اسی سلسلے میں نازل ہوئی۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب قبیلہ نجران کے نصاریٰ کا وفد آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو مدینہ کے یہودی علما بھی آگئے اور آں حضور کی مجلس ہی میں آپس میں تکرار کرنے لگے، یہودیوں میں سے رافع بن حریملہ نے اہل نجران سے کہا کہ تم کسی بنیاد پر نہیں ہو اور عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی نبوت کا انکار کرنے لگا۔ اس پر نصاریٰ کی طرف سے نجران کے وفد کے ایک شخص نے کہا کہ تم لوگ کسی بنیاد پر نہیں ہو، اس نے موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور توریت کا انکار کیا۔ اس پر مذکورۂ بالا آیت نازل ہوئی۔ ربیع سے بھی اختصار کے ساتھ اسی کے مطابق روایت ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہود نے کہا کہ نصاریٰ کے دین کے صحیح ہونے کی کوئی بنیاد نہیں ہے اور نصاریٰ نے یہی بات ان پر الٹ دی کہ یہودیوں کا دین بے بنیاد ہے اور ان کے پاس اس کے صحت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ آیت مومنین کی اطلاع کے لیے ہے کہ کس طرح دونوں فریق کتاب اللہ کے حکم کو ضائع کر رہے ہیں، کیونکہ توریت و انجیل دونوں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ وہ دونوں کتابیں اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوئی تھیں (اگرچہ بعد میں دونوں فرقوں نے ان میں تحریف کر لی تھی)۔ اگر دیانت کے ساتھ انجیل پر ایمان ہو تو اس سے خود ہی توریت کے مضامین کی اور موسیٰ علیہ الصلٰوۃ والسلام کی نبوت کی تصدیق ہوتی ہے، اسی طرح توریت سے عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور آپ کی شریعت کی تصدیق و تائید ہوتی ہے، اس کے باوجود کتنے افسوس کی بات ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو بے بنیاد ٹھہراتے ہیں اور اللہ کے نبی اور اس کی کتاب کا سرے سے انکار کرتے ہیں، حالانکہ دونوں فریق اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں جس سے ان کے اس دعوے کی خود ہی تردید ہوتی ہے۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت خود تمام پچھلی شرائع کے احکام کو منسوخ کرتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے وقت میں ان کے منجانب اللہ ہونے کی بھی تصدیق کرتی ہے۔ اس آیت سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس میں ان کی شریعت کی تصدیق کی گئی ہے، بلکہ مفہوم یہ ہے کہ یہودی، نصاریٰ کے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انجیل سرے سے آسمانی کتاب ہی نہیں اور عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی طرف سے بھیجے ہی نہیں گئے تھے۔ اسی طرح کا دعویٰ نصاریٰ یہودیوں کے متعلق کرتے ہیں اور یہ غلط ہے، کیونکہ اپنے وقت کے لیے دونوں انبیا حق تھے اور دونوں کتابیں واجب العمل اور اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں۔
چنانچہ قتادہ اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہما سے روایت ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہودیوں نے کہا کہ نصاریٰ کا پہلا طبقہ ہی کسی بنیاد پر نہیں تھا اور اسی طرح نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودیوں کا پہلا طبقہ ہی کسی بنیاد پر نہیں تھا۔ "وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ" میں "الکتاب" سے مراد کتاب اللہ یعنی توریت و انجیل ہے یعنی دونوں فریق کی تردید خود ان کی اپنی کتاب کرتی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کی تفسیر میں روایت ہے کہ مطلب یہ ہے کہ جس چیز کا وہ انکار و کفر کرتے ہیں خود اپنی کتاب میں اس کی تلاوت

Marfat.com

کرتے ہیں، یعنی یہودی عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس توریت ہے اور اس میں ان سے عہد لیا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی وہ تصدیق کریں، اسی طرح انجیل میں موسیٰ علیہ السلام اور توریت کی تصدیق کی گئی ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے، لیکن اس کے باوجود ہر فریق دوسرے کی تکذیب کرتا ہے۔[1]

«کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ» (اسی طرح ان لوگوں نے بھی کہا انھیں کا سا قول جو کچھ بھی علم نہیں رکھتے) مفسرین کے اس کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں کہ «اسی طرح ان لوگوں نے بھی کہا جو کچھ بھی علم نہیں رکھتے» سے مراد کون لوگ ہیں۔ ربیع اور قتادہ سے روایت ہے کہ مطلب یہ ہے کہ «نصاریٰ بھی اپنے پیشرو یہودیوں کی سی بات کہنے لگے»۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد وہ امتیں ہیں جو یہود و نصاریٰ اور توریت و انجیل سے پہلے گذری ہیں۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ مراد مشرکین عرب ہیں، وہ اہل کتاب نہیں تھے، اس لیے ان سے علم کی نفی کی گئی۔ چنانچہ سدی رح سے روایت ہے کہ مراد مشرکین عرب ہیں، انھوں نے بھی اہل کتاب کی طرح کہا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی بنیاد پر نہیں ہیں۔ اتنی بات تو ظاہر ہے کہ جن کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے انھیں اللہ تعالیٰ نے جہل کے وصف کے ساتھ متصف کیا ہے اور ان سے اس علم کی نفی کی ہے جو یہود و نصاریٰ کے پاس تھا، مطلب آیت کا یہ ہے کہ جس طرح یہود و نصاریٰ آپس میں ایک دوسرے کو بے بنیاد قرار دیتے ہیں، اپنی جہالت کی وجہ سے اس طبقہ نے بھی ایسا ہی کہا۔ یہ طبقہ مشرکین عرب کا بھی ہو سکتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مراد یہود و نصاریٰ سے پہلے کی کوئی امت ہو۔ کسی کے متعلق یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہی مراد ہے، کیونکہ کوئی وجہ ترجیح موجود نہیں ہے، کتاب اللہ میں بھی اسے عام ہی رکھا گیا ہے اور حدیث نبوی میں بھی اس کی تعیین نہیں کی گئی۔ مقصد آیت کا مومنین کو یہ بتانا ہے کہ یہود و نصاریٰ باطل کی پیروی کر رہے ہیں، انبیاء پر افترا پردازی اور بہتان کا شیوہ اختیار کیے ہوئے ہیں، حالانکہ وہ اہل کتاب ہیں، انھیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں باطل ہے اور ان کا انکار اللہ پر افترا اور جھوٹ ہے، درحقیقت اپنے اس طرز عمل سے یہ دونوں فریق ان قوموں کی پیروی کر رہے ہیں جو اللہ، اس کی کتاب اور اس کے رسولوں کی ہدایات سے بالکل بے بہرہ اور جاہل ہیں، اور جنھیں وحی و نبوت کا کوئی علم نہیں ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر اور اس علم کے بعد کہ اللہ نے فلاں چیز سے منع کیا ہے، کوئی شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا گناہ اس شخص کے گناہ سے زیادہ سنگین ہے جو جہالت اور ناواقفیت میں گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ کیونکہ آیت میں زجر و توبیخ اصل میں یہود و نصاریٰ ہی کو ہے جو علم کتاب و وحی رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ غلط ہے۔ «فَاللّٰهُ یَحْکُمُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ» (سو اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن اس باب میں فیصلہ کر دے گا جس میں وہ جھگڑتے رہتے ہیں) یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان آپس میں ایک دوسرے کو بے بنیاد کہنے والوں کے درمیان فیصلہ کرے گا، اور اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے طاعت گذار بندوں کو ان کی اطاعت و فرماں برداری پر اپنی نعمتوں سے نوازے گا اور نافرمانوں کو بھی وہ سب کچھ مل جائے گا جس کی وعید وہ سن رہے ہیں اور سنتے آئے ہیں، انھیں معلوم ہو جائے گا کہ اس طرح افترا اور اختلاف کا بدلہ کیا ہوتا ہے۔ «یَوْمَ الْقِیٰمَةِ» میں لفظ «قِیٰمَة» مصدر ہے، قُمْتُ قِیَامًا وَقِیَامَةً (بمعنی کھڑا ہونا) سے نکلا ہے۔ قیامت سے مراد مخلوق کا اپنی قبروں سے نکل کر اپنے رب کے حضور کھڑا ہونا ہے، یعنی وہ دن جب مخلوق اپنی قبروں سے نکل کر اپنے رب کے پاس حشر کیلئے جمع ہوگی۔

---

[1] «الکتاب» سے مراد مجموعہ صحف بنی اسرائیل ہے، اسی کو آج عہد نامہ عتیق کہتے ہیں۔ یہودی اور عیسائی دونوں ان صحیفوں کے مقدس ہونے کے قائل ہیں۔ (تفسیر ماجدی)

Marfat.com

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ

اور اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہوگا جو خدا تعالیٰ کی مسجدوں میں اُن کا ذکر (اور عبادت) کیے جانے سے بندش کرے

وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ

اور اُن کے ویران ہونے (کے بارہ) میں کوشش کرے۔ اور ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت (اور بے باک) ہو کر ان میں قدم بھی نہ رکھنا چاہیے تھا

اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۬ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ

(بلکہ جب جاتے ہیبت اور ادب سے جاتے) ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی (نصیب) ہوگی اور (ان کو) آخرت میں بھی

عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا

سزائے عظیم ہوگی اور اللہ ہی کی مملوک ہیں (سب جہتیں) مشرق بھی اور مغرب بھی کیونکہ تم لوگ جس طرف منہ کرو

فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

ادھر ہی (اللہ تعالیٰ (کی ذات پاک) کا رخ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ (تمام جہات کو) محیط ہیں کامل العلم ہیں۔

سب سے بڑی محرومی

"وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا" (اور اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں کو اس سے روک دے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے) یعنی اس شخص سے بڑھ کر تعدی اور اللہ کے حکم کی خلاف ورزی میں دیدہ دلیری کرنے والا اور کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں اس کی عبادت سے لوگوں کو روک دے۔ "مَسَاجِدَ" مسجد کی جمع ہے، ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں اللہ کی عبادت کی جاتی ہے "سجود" کا مفہوم ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اس اعتبار سے "مسجد" کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ جگہ جہاں اللہ کو سجدہ کیا جاتا ہو۔ اسی طرح وہ جگہ جہاں بیٹھا جاتا ہے "مَجْلِس" کہلاتی ہے (جَلَسَ بمعنی بیٹھنے سے)۔ وہ جگہ جہاں اُترا اور قیام کیا جاتا ہے "مَنْزِل" کہلاتی ہے (نَزَلَ بمعنی اترنے سے)۔ پھر اس کی جمع "مَجَالِس" "مَنَازِل" استعمال ہوتی ہے، جیسے مسجد کی جمع مساجد ہے۔ "سَعٰى فِىْ خَرَابِهَا" میں سَعٰى کا عطف "مَنَعَ" پر ہے۔ اس سلسلے میں اہل تفسیر کے مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں کہ آیت سے کون لوگ مراد ہیں جنھوں نے اللہ کی مسجدوں میں لوگوں کو اللہ کے ذکر سے روکا تھا اور کن مساجد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ نصاریٰ نے اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے ذکر سے لوگوں کو روکا تھا اور یہ مسجد بیت المقدس کا ذکر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی منقول ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا کہ نصاریٰ مراد ہیں، یہ لوگ بیت المقدس میں گندگی ڈال دیتے تھے اور لوگوں کو اس میں نماز نہیں پڑھنے دیتے تھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مراد بخت نصر، اس کا لشکر اور اس کے معاون نصاریٰ ہیں جنھوں نے بیت المقدس کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ قتادہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہما سے یہی تفسیر نقل ہے، سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رومیوں نے بیت المقدس کی تباہی میں بخت نصر کی مدد اس لیے کی تھی کہ یہودیوں نے یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کو قتل کر دیا تھا۔ بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ کر دیا تھا اور اس میں گندگی ڈلوانے کا حکم دیا تھا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ مراد مشرکین عرب ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام

Marfat.com

سے روکا تھا۔ چناں چہ ابن زید سے روایت ہے کہ آیت میں اشارہ مشرکینِ عرب کی طرف ہے، کہ انھوں نے آں حضورؐ کو حدیبیہ کے
موقعہ پر مکہ میں داخل ہونے سے روکا تھا۔ آں حضورؐ نے بھی ان سے صلح کرلی اور قربانی کا جانور مقام ذی طُویٰ میں ذبح کیا اور مشرکینِ قریش
سے فرمایا کہ بیت اللہ سے کسی کو نہیں روکا جاتا تھا (زمانہ جاہلیت میں بھی) اگر کسی کو اس کے باپ یا بھائی کا قاتل بھی ملتا تو وہ اسے بیت اللہ سے
نہیں روکتا تھا۔ قریش یہ کہتے تھے کہ بدر کی لڑائی میں ہمارے باپ دادوں کو قتل کرنے والے ہمارے جیتے جی ہمارے شہر میں نہیں داخل
ہو سکتے (آخر صلح اس پر ہوگئی کہ آئندہ سال آں حضورؐ مکہ میں داخل ہو سکتے ہیں) "سَعٰی فِیْ خَرَابِهَا" کا مطلب اس تفسیر میں یہ ہوگا
کہ مشرکین نے اللہ کے ذکر کے لیے عمرہ کرنے والے (آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضؓ کو) بیت اللہ سے روک دیا تھا۔
میرے نزدیک بہتر تفسیر یہ ہے کہ آیت کا مصداق نصاریٰ ہیں۔ انھوں نے ہی بیت المقدس کی تباہی کے لیے کوششیں کی تھیں،
بخت نصر کی انھوں نے ہی مدد کی تھی اور جب بخت نصر تباہی مچانے کے بعد اپنے ملک واپس چلا گیا تو وہ نصاریٰ ہی تھے جنھوں نے
اس وقت کے مومن بنی اسرائیل کو اللہ کے گھر میں نماز پڑھنے سے روکا تھا۔
آیت کی تفسیر کے سلسلے میں تین اقوال مفسرینؒ سے نقل ہوئے ہیں، اور مسجد کی تعیین کے سلسلے میں صرف دو مساجد کا ذکر ہے، ایک
بیت المقدس اور دوسرے مسجد حرام۔ ظاہر ہے کہ مشرکینِ قریش نے مسجدِ حرام کی بربادی کی کوشش کبھی نہیں کی، بلکہ اس کا ہمیشہ اپنے
عقیدہ کے مطابق احترام ملحوظ رکھا۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات انھوں نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضؓ کو اس میں
ادائیگی نماز اور ذکر اللہ سے روکا، لیکن آیت میں صرف اسی کا ذکر نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ "انھوں نے اس کی بربادی کی کوشش کی"۔
سب کو معلوم ہے کہ مشرکینِ قریش نے جاہلیت کے دور میں مسجد حرام کی تعمیر کی تھی اور اس پر وہ فخر کیا کرتے تھے، اس لیے اس آیت کا
مصداق مسجد حرام یا مشرکینِ مکہ نہیں ہو سکتے۔ یہ الگ بات ہے کہ مسجد حرام میں ان کے اعمال وافعال اور اس سے متعلق ان کے عقائد اللہ کی
مرضی کے خلاف تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس سے پہلے کی آیتوں میں بھی مشرکینِ مکہ یا مسجدِ حرام کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ یہود و نصاریٰ
ہی کا ذکر ہے اور انھیں کے اعمال وافعال کی مذمت کی گئی ہے۔ آیت کے اولین مصداق سے قطع نظر، الفاظ آیت میں عموم ہے اور واضح
ہوتا ہے کہ اللہ کی مسجد میں نماز پڑھنے والے کو روکنے والے، خواہ نماز فرض ہو یا نفل، اور اس کی بربادی کی کوشش کرنے والے ظالمین

اور حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے ہے۔
"اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ" (یہ لوگ اس لائق ہی نہیں کہ ان میں داخل ہوں، مگر ہاں یہ کہ ڈرتے ہوئے)
انھیں کا ذکر ہے جو مساجد میں اللہ کے ذکر سے روکیں اور اس کی بربادی کی کوشش کریں کہ ان پر مساجد کا داخلہ حرام قرار دیا گیا، البتہ وہ اب
صرف خوف زدہ اور ڈرتے ہوئے داخل ہو سکتے ہیں۔ قتادہ اور سدی رحمہا اللہ سے روایت ہے کہ مراد نصاریٰ ہیں، ان کا داخلہ
بیت المقدس میں ممنوع ہے، اگر وہ وہاں مل جائیں تو انھیں سزا دی جائے گی۔ سدی نے فرمایا کہ روئے زمین پر آج کوئی رومی ایسا نہیں
جو بیت المقدس میں داخلہ کی جرأت کرے، اگر داخل ہوتا بھی ہے تو خوف زدہ ہو کر کہ کہیں اس کی گردن نہ مار دی جائے۔ ابن زید رحمۃ
اللہ علیہ نے اپنے مسلک کے مطابق فرمایا کہ مراد مسجد حرام ہے، اور آں حضورؐ نے اس کے بعد اعلان کروا دیا تھا کہ اس سال کے بعد
کوئی مشرک بیت اللہ کا حج نہیں کر سکتا اور نہ کوئی ننگا آدمی اس کا طواف کر سکتا ہے۔ "لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ"
(ان کے لیے دنیا میں بھی بڑی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے) انھیں کا ذکر ہے جو مساجد میں اللہ کے ذکر سے روکیں۔ "خِزْیٌ"
یعنی رسوائی و ذلت ہے، یہ ذلت انھیں قتل و قید ہو کر اٹھانی پڑے گی یا جزیہ ادا کر کے۔ قتادہ نے فرمایا کہ جزیہ کی ادائیگی کی ذلت مراد ہے۔ سدی
نے فرمایا کہ دنیا میں ان کی ذلت سے یہ مراد ہے کہ مہدی علیہ السلام جب اٹھیں گے اور قسطنطنیہ فتح ہوگا تو وہ انھیں قتل کریں گے، "خِزْیٌ"

Marfat.com

سے یہی مراد ہے۔ "عَذَابٌ عَظِيمٌ" سے مراد عذاب جہنم ہے جو کبھی کم اور ہلکا نہ ہوگا۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی مساجد میں اللہ کے ذکر کو روکنے، اس کی بربادی کی کوشش کرنے، روئے زمین پر فساد پھیلانے اور اپنے رب کا کفر کرنے کی سزا انھیں دنیا میں ذلت و رسوائی کی صورت میں اور آخرت میں بڑے عذاب کی صورت میں ملے گی۔

اللہ ہر جگہ ہے

"وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ" اور اللہ ہی کا ہے مشرق اور مغرب سو تم جدھر کو بھی منہ پھیرو اللہ ہی کی ذات ہے) یعنی مشرق و مغرب اللہ کی ملکیت ہیں۔ بولتے ہیں "لِفُلَانٍ هٰذِهِ الدَّارُ" یعنی یہ گھر فلاں کی ملکیت ہے، یہی صورت "لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ" میں بھی ہے۔ مشرق، وہ جگہ جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے، چمکتا ہے، اسے مطلع بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان جو کچھ ہے وہ سب اللہ ہی کا ہے، کیونکہ سورج کے طلوع و غروب کی جگہ روزانہ بدلتی رہتی ہے، ایک دن جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے سال بھر پھر وہاں سے نہیں طلوع ہوتا، یہی حال غروب کا ہے۔ آیت کے شان نزول کے سلسلے میں کئی اقوال ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہودی اپنی نماز ادا کرنے کے لیے بیت المقدس کی طرف رخ کیا کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک مدت تک بیت المقدس ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی، لیکن پھر آپ کا قبلہ کعبہ بنا دیا گیا تو یہودی اس پر اعتراض کرنے لگے اور کہنے لگے کہ آخر قبلہ بدلنے کی ضرورت کیا پیش آئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر ارشاد فرمایا کہ تمام مشرق و مغرب میری ملک ہیں، میں جس طرف چاہوں اپنے بندوں کا رخ نماز کے لیے پھیرنے کا حکم دوں اور اللہ تو ہر جگہ موجود ہے، تم جدھر بھی رخ کرو گے اللہ ہی کی ذات ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی روایت ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت نماز میں مسجد حرام (کعبہ) کی طرف چہرہ کرنے کے حکم کے فرض ہونے سے پہلے کی ہے، اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو بتایا گیا ہے کہ نماز جس طرف جی چاہے رخ کر کے پڑھیں، کسی خاص سمت کی طرف کرنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ تمام مشرق و مغرب اللہ ہی کی ملکیت ہیں جس طرف بھی تم رخ کرو گے اللہ ہی کی ذات ہے، اس سے کوئی جگہ خالی نہیں۔

جیسا کہ ارشاد ہے "اور نہ اس سے کم اور نہ زیادہ مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ ہی ہوتا ہے، خواہ وہ کہیں ہو" ان حضرات کا کہنا ہے کہ پھر یہ آیت اس حکم سے منسوخ ہو گئی جس میں نماز میں مسجد حرام کی طرف رخ کرنا فرض کیا گیا ہے۔ یہ قول قتادہ اور زید رحمۃ اللہ علیہما سے روایت ہے

تیسرا قول یہ ہے کہ اس آیت میں نفل نماز کا حکم بتایا گیا ہے کہ حالت سفر میں جس طرف بھی چاہو رخ کر کے نماز پڑھ سکتے ہو، اسی طرح فرائض میں بھی جب کہ دشمن سے جنگ ہو رہی ہو اور خوف شدید ہو تو جس طرف ممکن ہو سکے رخ کر کے نماز پڑھ سکتے ہو، کیونکہ اللہ ہر طرف ہے، جدھر بھی تم رخ کرو۔ چنانچہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ سفر میں جس طرف بھی تمہاری سواری متوجہ ہو جائے ادھر ہی رُخ کر کے نفل نماز پڑھ سکتے ہو، ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے واپس ہوئے تو آپؐ کا رُخ مدینہ کی طرف تھا اور آپ اشارہ سے اپنی سواری ہی پر نفل نماز پڑھتے آ رہے تھے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو کسی وجہ سے سمتِ قبلہ کی تعیین نہیں کر سکے تھے، اس لیے مختلف سمتوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی، اللہ تعالیٰ نے انھیں کے متعلق یہ حکم نازل کیا کہ اللہ کسی سمت و جہت کے ساتھ مقید نہیں ہے وہ تو ہر جگہ موجود ہے، اس لیے ایسی حالت میں اگر غیر قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لی تب بھی ہو جائے گی۔

عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ نے بیان کیا کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، رات اندھیری اور تاریک تھی، پھر ہم نے ایک جگہ قیام کیا۔ وہاں لوگوں نے چند پتھر جمع کر کے نماز پڑھنے کی جگہ بنائی اور نماز پڑھی گئی۔

Marfat.com

صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ نمازیں ہمارا رخ قبلہ کی طرف نہیں تھا۔ ہم نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا کہ یا رسول اللہ، ہم نے رات غیر قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھ لی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت نازل کی نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے اسی کے مطابق فتویٰ نقل ہوا ہے۔

پانچواں قول یہ ہے کہ آیت حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی، ان کی وفات قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے سے پہلے ہی ہوگئی تھی، اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ ان کی نمازوں کا کیا حکم ہوگا۔ آیت اسی پر نازل ہوئی کہ اللہ کی رضاجوئی کی غرض سے اس کے حکم کے مطابق جدھر بھی رخ کرکے نماز پڑھی جائے وہ مقبول ہے، کیونکہ اللہ ہر جگہ اور ہر سمت میں ہے۔ چناں چہ قتادہ سے روایت ہے کہ نجاشی کی وفات پر آں حضور ﷺ نے صحابہ رضؓ سے فرمایا کہ ان کی نماز جنازہ پڑھو، صحابہ نے عرض کی، ایسے شخص کی نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے جو مسلمان بھی نہیں تھا؟ اس پر ان کے ایمان کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی "اور اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ضرور ہیں جو اللہ پر، اور جو کچھ تم پر اتارا گیا ہے، اور جو کچھ ان پر اتارا گیا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں، اللہ سے ڈرنے والے ہیں" صحابہؓ نے عرض کی کہ انھوں نے تو قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز نہیں پڑھی۔ تو زیر تفسیر آیت نازل ہوئی۔

ظاہر ہے کہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہیں، اور مشرق و مغرب کے خصوصی ذکر سے بھی عموم ہی مراد ہے، کیونکہ جیسا کہ ہم نے پہلے اس کی وضاحت کی، اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو ان کے درمیان میں ہے، اس لیے ضروری ہے کہ مشرق و مغرب اور اس کے درمیان میں بسنے والی تمام مخلوقات اس کے تابع فرمان ہوں پس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ تمام مخلوق جو مشرق و مغرب کے درمیان میں رہتی ہے اللہ کی مملوک ہے، وہ جس طرح چاہے انھیں استعمال کرے اور جو چاہے حکم دے، اس لیے اے مسلمانو! تم بھی اپنا رخ میری ہی طرف پھیرو، اور میں ہر جگہ ہوں جدھر بھی تم رخ کروگے۔ آیت کے الفاظ عام ہیں اس لیے عمومی مفہوم تو اس کا یہی ہے، لیکن یہاں مراد خاص ہے۔ پس یا تو اس سے مراد یہ ہوگا کہ نفل نماز حالت سفر میں جدھر بھی رخ ہو جائے اسی سمت میں پڑھ سکتے ہو، اسی طرح فرض نماز دشمن سے مقابلہ اور خوف کے وقت میں غیر قبلہ کی طرف رُخ کرکے بھی پڑھ سکتے ہو، جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ اور نخعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ دوسرے حضرات سے اسی طرح کی روایت منقول ہے۔ یا آیت کی مراد یہ ہوگی کہ تم روئے زمین پر جہاں بھی ہو مشرق میں یا مغرب میں، بہر حال کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھو، تمہارا قبلہ کعبہ ہے، مشرق و مغرب نہیں، کیونکہ اللہ مشرق و مغرب کی قیود و حدود سے بالاتر ہے، دعا و عبادت کے لیے تم جدھر بھی رخ کروگے اللہ کو پاؤ گے، وہ ہر جگہ تمہاری سننے والا اور تمہاری دعاؤں کو قبول کرنے والا موجود ہے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ آپ نے بیان کیا کہ جب آیت "مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا"، نازل ہوئی تو صحابہ رضؓ نے عرض کی کہ کس طرف رخ کرکے ہم دعا کریں۔ اس پر آیت نازل ہوئی۔ آیت میں احتمال ان دونوں توجیہوں کا ہے لیکن اس کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس آیت سے بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم منسوخ ہوا تھا، اس کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ آیت بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے کے زمانہ کے بعد نازل ہوئی ہے اور اس میں کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے بلکہ اس کے برعکس اہل علم صحابہ اور ائمہ تابعین نے اس کا انکار کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کوئی حدیث اس کی تعیین کے سلسلے میں ثابت نہیں ہے، اس لیے آیت کے ناسخ ہونے کی توجیہ قابل قبول نہیں ہے۔ "فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا"، میں "اَيْنَمَا" کا معنی ہے "جدھر بھی"، "تُوَلُّوْا"، "وَلَّيْتُ وَجْهِيْ اِلٰى فُلَانٍ"، یعنی میں نے فلاں کی طرف اپنا چہرہ پھیرا، سے نکلا ہے (پھیرنے کے معنی میں) "فَثَمَّ"، کا معنی ہے "وہیں پر"۔ آیت میں "فَثَمَّ وَجْهُ اللہ"، کا مفہوم مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ نقل ہے کہ "وہیں پر اللہ کا قبلہ ہے"۔ ایک قول یہ ہے کہ "وہیں پر اللہ تبارک و تعالیٰ ہے" تیسرا قول یہ ہے کہ "جس طرف بھی رخ کرکے تم اللہ کی خوشنودی حاصل کروگے اس کی رضا و خوشنودی تمھیں ملے گی"۔ اس آیت کا

Marfat.com

ربط پہلی آیت سے ہے، مطلب یہ ہے کہ نصاریٰ سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا کہ انھوں نے اللہ کے بندوں کو اس کی مساجد میں نماز و ذکر سے روکا، اور ان کی بربادی کی کوشش کی، اور مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے ہیں، پس جدھر بھی تمہارا رخ ہو ادھر ہی اللہ کا ذکر اور اس کی یاد کرو، تم اس کے فضل اور اس کی رضا سے محروم نہیں رہوگے۔ "إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ" (بلا شبہ اللہ بڑی وسعت والا بڑا علم والا ہے) "وَاسِعٌ" (وسعت والا) کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے افضال، جود و کرم تمام مخلوقات پر محیط ہیں، وہ سب کی ضروریات پوری کرتا ہے اور تمام عالم کی تدبیر کرتا ہے۔ "عَلِيمٌ" یعنی بندوں کے تمام افعال و اعمال کا جاننے والا ہے، اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں، اور نہ کوئی چیز اس کے احاطۂ علم سے باہر ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اولاد رکھتا ہے سبحان اللہ (کیا مہمل بات ہے) بلکہ خاص اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں

وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ○ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

(موجودات ہیں) (اور) سب ان کے محکوم بھی ہیں (حق تعالیٰ) موجد (بھی) ہیں آسمانوں اور زمین کے

وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○

اور جب کسی کام کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو بس اس کام کی نسبت (اتنا) فرما دیتے ہیں کہ ہو جا بس وہ (اسی طرح) ہو جاتا ہے۔

عقیدۂ ابنیت کی تردید

"وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ایک بیٹا بنا لیا ہے، پاک ہے وہ!۔ اصل یہی ہے کہ اسی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے) مراد وہی لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی مساجد میں اس کے ذکر کو روکا تھا، اس کا تعلق بھی پہلی آیت "وَسَعٰى فِي خَرَابِهَا" سے ہے یعنی نصاریٰ جو عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں۔ آیت میں ان کے اسی عقیدہ کی تردید ہے، اور ان کی ہفوات سے اللہ کی پاکی اور تقدیس بیان کی گئی ہے۔ "سُبْحَانَ اللّٰهِ" کا مفہوم ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ زمین و آسمان سب کچھ اللہ ہی کی ملکیت ہیں، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہوں۔ اگر اللہ کے وہ بیٹے ہوتے تو زمین و آسمان سے ماوراء ہوتے، جب وہ بھی زمین کی ایک مخلوق کی طرح تمہارے درمیان رہے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اللہ کے بیٹے ہوں یہ تو اللہ کی ملکیت ہے، اور عیسیٰ علیہ السلام بھی اسی میں سے تھے۔ "كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ" کی ایک تفسیر یہ ہے کہ "سب اسی کے مطیع اور حکم بردار ہیں"۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ، مجاہد، سدی اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہم سے یہی منقول ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ کافر کی اطاعت یہ ہے کہ اس کا سایہ سجدہ کرتا ہے، سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب مخلوق اس کی مطیع ہو کر حاضر ہوگی اور کوئی اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکے گا۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک تفسیر یہ نقل ہوئی ہے کہ "سب اس کے لیے اپنی عبودیت کے اقرار کرنے والے ہیں"۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ "سب قیامت کے دن اس کے لیے کھڑے ہوں گے"۔

کلام عرب میں "قُنُوت" (جس سے "قٰنِتُوْنَ" نکلا ہے) کے کئی معنی ہیں۔ ایک طاعت، دوسرا قیام (کھڑا ہونا) تیسرا کلام سے رک جانا، خاموش ہو جانا ہے۔ یہاں بہتر مفہوم طاعت کا ہے، یعنی سب اللہ کے مطیع اور اس کے حکم بردار ہیں اور اپنی

Marfat.com

ظاہری ساخت سے اپنی عبودیت و بندگی کی شہادت دیتے ہیں اور یہ کہ اللہ ہی سب کا بنانے والا ہے۔ اس مفہوم کو بہتر قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تردید کی ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ کے بیٹا ہے اور فرمایا کہ آسمان و زمین سب اسی کی ملکیت ہیں، پھر ارشاد ہوا کہ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے وہ سب اس کی حکم بردار ہے، اور اپنے ظاہری ساخت سے اپنے رب اور خالق کے وجود اور اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہے۔ مسیح علیہ السلام بھی انھیں میں سے ایک تھے، آخر وہ اپنی فانی صفات کے ساتھ اللہ کے بیٹے کیسے ہو جائیں گے۔ "بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" یعنی وہ موجد ہے آسمانوں اور زمین کا "بَدِیْعٌ"، مُبْدِعٌ (موجد) کے معنی میں ہے جیسے "اَلِیْمٌ"، مُؤْلِمٌ کے معنی میں اور "سَمِیْعٌ"، مُسْمِعٌ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسے کہتے ہیں جو ایسی چیز بنا دے جو اس سے پہلے کسی نے نہ بنائی ہو۔ اسی سے دین میں نئی چیز ایجاد کرنے والے کو "مُبْتَدِعٌ" کہتے ہیں۔ ہر ایسے شخص کو جس نے بغیر کسی سابقہ نمونہ و مثال کے کوئی نئی بات پیدا کی ہو "مبتدع" کہتے ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی ذات پاک ہے، اس کا کوئی بیٹا کس طرح ہو سکتا ہے، وہ تو تمام آسمانوں اور زمین کا مالک ہے سب اس کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں اور زبانِ حال سے اس کی طاعت کا اقرار کرتے ہیں، وہی اُن کا خالق و موجد ہے، اس نے انھیں اس وقت پیدا کیا جب کوئی چیز ویسی موجود نہیں تھی، مسیح علیہ السلام کو بھی اس نے اپنی قدرت سے بغیر والد کے، ایک نئے ڈھنگ سے پیدا کیا۔ "بَدِیْعٌ" کا مفہوم جو ہم نے بیان کیا وہی ربیع اور سدی رحمۃ اللہ علیہما سے بھی نقل ہوا ہے۔

"وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" (اور جب کسی کام کا کرنا ٹھہرا لیتا ہے تو بس اتنا ہی اس سے کہتا ہے کہ ہو جا، اور وہ ہو جاتا ہے) "اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا" یعنی جب کسی کام کا کرنا ٹھہرا لیتا ہے اور اس کا قطعی فیصلہ کر لیتا ہے۔ "قضاء" کا اصل مفہوم معاملات کا فیصلہ کرنا اور اس سے فارغ ہو جانا ہے۔ لوگوں کے مقدموں کا فیصلہ کرنے والے حاکم کو اسی سے "قاضی" کہتے ہیں، کیونکہ وہ مقدمات کے فیصلے کرتا ہے اور ایک قطعی حکم سنا کر فارغ ہو جاتا ہے۔ میّت کے متعلق اسی سے کہتے ہیں کہ "قَضٰی"، یعنی دنیا سے فارغ ہو گیا اور یہاں سے چلا گیا۔ دن کے ڈوبنے کے لیے بولتے ہیں "تَقَضَّى النَّهَارُ" یعنی دن ڈوب گیا، ختم ہو گیا۔ یہی معنی اس آیت میں ہیں "وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ" (اور تیرے رب نے حکم دے رکھا ہے کہ بجز اس ایک رب کے اور کسی کی پرستش نہ کرنا)۔ "وَقَضَيْنَاۤ اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ" یعنی ہم نے بتا دیا اور انھیں خبر دے کر فارغ ہو گئے۔ "فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" یعنی جب کسی کام کا کرنا ٹھہرا لیتا ہے تو بس اتنا ہی اس سے کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ اللہ کے حکم اور ارادہ کے مطابق ہو جاتا ہے۔

بعض حضرات نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ آیت میں ان چیزوں کے متعلق بیان کیا گیا ہے جو پہلے سے موجود ہیں کہ جب ان میں کسی تصرف کا فیصلہ کرتا ہے تو صرف یہ کہنے کی دیر ہوتی ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ یعنی جب کسی مردہ چیز کو زندہ کرنے کا یا زندہ کو مردہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے یا اسی طرح کی اور دوسری صورتیں۔ اس کی مثال قوموں پر عذابِ الٰہی سے دی جا سکتی ہے، مثلاً ایک قوم کو زمین میں دھنسا دیا گیا تھا، تو وہ پہلے سے موجود تھی پھر اس پر اللہ کے حکم سے عذابِ الٰہی آیا۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ بظاہر آیت کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن مفہوم اس کا خاص ہی ہے کیونکہ "يَقُوْلُ لَهٗ" میں "لَهٗ" کی ضمیر کسی موجود ہی کی طرف لوٹائی جا سکتی ہے۔ دوسرے مفسرین کا کہنا ہے کہ جب آیت کے الفاظ عام ہیں تو اس کے مفہوم و معنی میں تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہیے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں سب کچھ ہے، وہ بھی جو وجود میں آ چکی ہیں اور وہ بھی جن کا ابھی وجود نہیں ہوا ہے، اس لیے وہ اپنے علم کے مطابق اشیاء کو موجود ہونے کا حکم دیتا ہے اور وہ موجود ہو جاتی ہیں، گویا چیز اگرچہ خارج میں موجود

نہیں ہے، لیکن علم الٰہی میں تو بہرحال موجود ہے اور "لَہٗ" کی ضمیر اسی طرف لوٹتی ہے۔ علم الٰہی کے اعتبار سے مامور و موجود میں کوئی فرق نہیں، وہاں زمانہ نہیں ہے، بلکہ ہر مامور، موجود ہے اور ہر موجود، مامور ہے۔ اس طرح اس کا وسیع تصرف ہر صورت میں موجود ہے۔ تیسرا قول اس سلسلے میں یہ ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب وہ کسی کام کا کرنا ٹھہرالیتا ہے تو وہ خود ہی ہوجاتا ہے، بغیر کچھ کہے ہوئے۔ اس قول کی بنیاد پر آیت میں "یَقُوْلُ" (یعنی کہتا ہے) کی صورت "قَالَ فُلَانٌ بِرَاْسِهٖ" کی سی ہے، یہاں "قَالَ" کہنے کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ معنی ہے "فلاں نے اپنے سر سے اشارہ کیا"۔ یہی صورت آیت میں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کچھ کہتا نہیں، صرف فیصلہ کرتا ہے اور وہ چیز موجود ہوجاتی ہے۔ آیت کا بہتر مفہوم یہی ہے کہ اسے عام رکھا جائے۔ الفاظ بھی اس کے عام ہیں اور کسی دلیل کے بغیر اس کے عموم کو ختم کرنا اور باطنی معنی مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو وجود میں لانے کا ارادہ کرتے ہیں تو "کُنْ" کہنے سے وہ چیز ارادۂ الٰہی کے مطابق اسی لمحہ موجود ہوجاتی ہے، جیساکہ ایک دوسری آیت میں ہے کہ "اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں پھر جب وہ تمھیں پکار کر زمین سے بلائے گا تو تم یکبارگی نکل پڑو گے"۔ یعنی جوں ہی اللہ کی پکار ہوگی لوگ فوراً اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے، نہ وہ اس سے پہلے نکل سکتے ہیں اور نہ اس کے بعد ان کے نکل پڑنے میں کوئی تاخیر ممکن ہے۔

جن حضرات نے آیت میں "یَقُوْلُ" کا مفہوم کہنا نہیں مراد لیا ہے، بلکہ "قَالَ فُلَانٌ بِرَاْسِهٖ" (فلاں نے اپنے سر کے ذریعہ اشارہ کیا) کی سی صورت بتائی ہے وہ محاورۂ زبان اور کتاب اللہ دونوں کے مخالف ہے اور غلط ہے۔ کیونکہ آیت میں "کُنْ" مقولہ نقل ہوا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ہوجا" (کُنْ) اور وہ ہوجاتا ہے، پھر آخر کیا ضرورت ہے اسے مجازی معنی میں لینے کی اور تاویلات کرنے کی۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ایک بیٹا بنالیا ہے"، اللہ کی ذات اس سے پاک ہے کہ اس کے بیٹا ہو، وہ تو آسمانوں اور زمین اور اس میں موجود سب کا مالک ہے، سب اس کی عبودیت اور بندگی کا زبانِ حال سے اقرار کرتے ہیں اور اس کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں، بھلا کوئی اس کا بیٹا کیسے ہوسکتا ہے، اس نے تو آسمانوں اور زمین کو بغیر کسی نمونہ اور مثال کے خود ایجاد کیا ہے، اور یہی صورت مسیح علیہ السلام کے ساتھ بھی پیش آئی کہ بغیر والد کے انھیں پیدا کیا، یہ سب اس کی قدرت و سلطانی کا مظاہرہ ہے، وہ کسی چیز سے معذور و مجبور نہیں، بلکہ جب کوئی کام ٹھہرالیتا ہے تو فرماتا ہے کہ "ہوجا"، اور وہ اس کے منشاء اور ارادہ کے مطابق ہوجاتا ہے، اسی طرح جب اس نے چاہا مسیح علیہ السلام کو بھی والد کے بغیر پیدا کیا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ

اور (بعضے) جاہل یوں کہتے ہیں کہ (خود) ہم سے کیوں نہیں کلام فرماتے اللہ تعالیٰ یا ہمارے پاس کوئی اور ہی دلیل آجاوے

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ

اسی طرح وہ (جاہل) لوگ بھی کہتے چلے آئے ہیں جو ان سے پہلے ہو گذرے ہیں ان ہی کا سا (جاہلانہ) قول ان سب کے قلوب (کج فہمی میں) باہم

قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○ اِنَّآ

ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ ہم نے تو بہت سی دلیلیں صاف صاف بیان کر دی ہیں (مگر وہ) ان لوگوں کے لیے (نافع ہیں) جو یقین حاصل کرنا چاہتے ہیں (رسول نے)

Marfat.com

اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ

آپ کو ایک سچا دین دے کر بھیجا ہے کہ خوشخبری سناتے رہیئے اور ڈراتے رہیئے اور آپ سے دوزخ میں جانے والوں کی بازپرس نہ ہوگی۔

بے سروپا مطالبے

"وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ" اور جو علم سے بے بہرہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا؟ یا ہمارے پاس کوئی نشان کیوں نہیں آجاتا، مفسرین سے اس سلسلے میں مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں کہ آیت سے مراد کون لوگ ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یہ نصاریٰ ہیں ایک قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودی مراد ہیں۔

چناں چہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رافع بن حریملہ یہودی نے آں حضور سے کہا تھا کہ اگر واقعی آپ اللہ کے رسول ہیں تو پھر اللہ سے کہیئے کہ ہم سے بھی بات کرے اور ہم بھی اس کا کلام سنیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

تیسرا قول یہ ہے کہ مشرکین عرب مراد ہیں۔ قتادہ ربیع اور سدی سے یہی روایت ہے کہ مشرکین عرب نے یہ مطالبہ کیا تھا میرے نزدیک بہتر قول یہ ہے کہ مراد نصاریٰ کو لیا جائے، کیونکہ پہلے سے انھیں کا تذکرہ چلا آرہا ہے اور ان کے باطل عقائد کی تردید کی جارہی ہے یعنی یہ اللہ کے رتبہ اور اس کی حقیقت سے ناواقف نصاریٰ، جو اللہ کے ساتھ غیر کے شرک کے بھی مرتکب ہیں، کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے بھی اسی طرح کیوں بات نہیں کرتا جس طرح وہ اپنے انبیاء اور رسولوں سے بات کرتا ہے، یا ہمارے پاس کوئی نشان کیوں نہیں لاتا، حالانکہ اللہ صرف اپنے اولیاء اور مقربین سے بات کرتا ہے اور انھیں کو معجزہ اور نشان دیتا ہے۔ جھوٹے دعویوں سے نہ وہ بات کرتا اور نہ کوئی معجزہ دیتا۔ جن لوگوں نے آیت سے "مشرکین عرب" مراد لیا ہے انھوں نے بلا کسی دلیل کے ایک بات کہدی ہے "لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ" میں "لَوْلَا" بمعنی هَلَّا (کیوں نہیں) ہے، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ معنی یہ ہے کہ "اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا"۔ "اٰيَةٌ" بمعنی علامت ہے، جیسا کہ پہلے گذر چکا یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ "یا ہمارے مطالبہ کے مطابق آپ بھی، پچھلے انبیاء کی طرح، کوئی علامت کیوں نہیں لاتے"۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ" (اسی طرح ان لوگوں نے بھی کہا تھا جو ان سے پہلے ہو چکے ہیں انھیں کا سا کہنا، ان کے دل متشابہ ہو گئے۔) اس آیت سے مراد جماعت کی تعیین میں بھی مفسرین سے کئی اقوال منقول ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آیت "اسی طرح ان لوگوں نے بھی کہا تھا جو اس سے پہلے ہو چکے ہیں" سے مراد یہود ہیں قتادہ، سدی اور ربیع رحمہم اللہ سے نقل ہے کہ مراد یہود و نصاریٰ دونوں ہیں۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ آیت سے یہود مراد ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں خود اس سے پہلے گذر چکا، انھوں نے ہی موسیٰ علیہ السلام سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ انھیں اللہ کو علانیہ دکھایا جائے اور اللہ تعالیٰ خود ان سے بات کرے، اور اسی طرح کے بے سروپا سوالات و مطالبات کیئے۔ اور بعد میں نصاریٰ نے بھی یہی سوال اسی انداز میں کیا، اس لیئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ انھوں نے بھی وہی بات کہی جو ان سے پہلے یہود کہہ چکے تھے اور وہی مطالبات پیش کیئے جو یہود ان سے پہلے کر چکے تھے۔ دونوں کے مطالبوں میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ اللہ کے کفر اور گمراہی میں ان کے دل ایک ہوگئے ہیں، اگرچہ اللہ کی طرف جھوٹی اور غلط باتیں منسوب کرنے میں ان کے طریقے مختلف ہیں، لیکن اللہ کے کفر اور انبیاء کے ساتھ گستاخانہ طرز عمل میں ان کے دل ایک ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی معنی منقول ہیں کہ یہود و نصاریٰ کے دل ایک دوسرے سے مشابہ ہو گئے۔ لیکن ایک دوسرا قول یہ ہے کہ مراد یہ ہے کہ مشرکین عرب، یہود و نصاریٰ اور دوسری مشرک اور کافر قوموں کے دل ایک دوسرے سے مشابہ ہو گئے۔ قتادہ اور ربیع سے یہ قول نقل ہوا ہے۔

Marfat.com

آیت کا مطلب یہ ہے کہ نصاریٰ جو اللہ کے رتبہ اور اس کی عظمت سے ناواقف ہیں، کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے اسی طرح کلام کیوں نہیں کرتا جس طرح وہ اپنے انبیاء اور رسولوں سے کلام کرتا ہے، یا ہمارے پاس کوئی علامت اور معجزہ کیوں نہیں آجاتا کہ سچ اور جھوٹ کھل کر سامنے آجائے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس مطالبے کو نقل کرکے فرماتا ہے کہ بالکل اسی طرح کی باتیں اس سے پہلے یہودیوں نے بھی کہی تھیں اور اسی طرح کا تحکمانہ مطالبہ ہمارے رسول سے انھوں نے بھی کیا تھا کہ اللہ کو انھیں علانیہ طور پر دکھایا جائے اور معجزہ لایا جائے۔ دراصل اللہ کے ساتھ سرکشی، اللہ کی عظمت سے ناواقفیت اور اس کے انبیاء کے سامنے جرأت ہیں ان کے دل ایک دوسرے سے اسی طرح مشابہ ہوگئے ہیں جس طرح ان کی باتوں اور ان کے مطالبوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

"قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ" (ہم نے اپنے نشان تو کھول کھول دیئے ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں)۔ یعنی ہم نے وہ علامات و معجزات کھول کھول دیئے ہیں کہ جن کے ظہور کے باوجود سرکشی اور کفر پر قائم رہنے کی وجہ سے یہود پر اللہ کا غضب نازل ہوا، ان میں سے بندر اور خنزیر بنا دیئے گئے اور آخرت میں بھی انھیں ذلت آمیز عذاب ہوگا، اور جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کو دنیا میں ذلیل و رسوا کیا اور آخرت میں ان کے لیے رسوائی اور عذابِ الیم تیار کر رکھا ہے۔ دوسری طرف مومنین و مسلمین کا طبقہ ہے کہ معجزات و نشانات کو دیکھ کر ان کا ایمان و یقین اور بڑھ گیا، ایسے مخلص اور اللہ کے فرماں بردار بندوں کو اللہ تعالیٰ نے جنت اور دارِ آخرت کی مسرتوں کا مستحق ٹھہرایا۔ آیت میں صرف ان لوگوں کا ذکر خاص کیا جو "یقین رکھتے ہیں"، کیونکہ یہی لوگ طالبِ حقیقت ہیں، یقین و اطمینان چاہتے ہیں اور معاملات میں انھیں استقلال حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق ارشاد فرمایا کہ جو لوگ ان صفات کے ساتھ متصف ہیں، ان کے لیے اپنے نشانات و معجزات اللہ تعالیٰ نے اس لیے کھول دیئے کہ ان کا یقین و اذعان اور پختہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح اور کھلی ہوئی نشانی کے بعد حقیقتِ حال کے بارے میں رائی برابر بھی شبہ ان کے دل میں نہ رہے، کیونکہ وہ یقین کی دولت سے پہلے ہی سے بہرہ ور ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بعد واضح نشان آجانے کے بعد ان کے سامنے حقیقتِ حال بالکل آئینے کی طرح روشن ہو جائے گی۔

آں حضورؐ کی ذمّہ داری

"اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا" (ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر) یعنی اے محمد! ہم نے آپ کو اسلام کا پیغام دے کر بھیجا ہے۔ یہ پیغام حق ہے، پس جو اس حق کو قبول کرے اور آپ کی اطاعت کرے تو آپ ہماری طرف سے ایسے دنیا میں کامیابی اور آخرت میں فوز و فلاح کی خوش خبری سنانے والے ہیں، لیکن جو آپ کی مخالفت اور نافرمانی کرے اور آپ کے پیغام و دعوت کو جھٹلائے، اُسے آپ دنیا کی رسوائی اور ذلت سے اور آخرت کے عذابِ جہنم سے ڈرانے والے ہیں۔

"وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ" (اور آپ سے اہلِ دوزخ کی بابت کچھ بھی پوچھ نہ ہوگی) "لَا تُسْئَلُ" کی مشہور و معروف قراءت تو یہی ہے یعنی ابتدا میں "تا" پر اور آخر میں "لام" پر پیش پڑھا جائے۔ اس صورت میں آیت خبر ہوگی، یعنی اے محمد! ہم نے آپ کو خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، اس لیے آپ کی ذمّہ داری صرف یہ ہے کہ جو پیغام ہے آپ اسے پہنچا دیں، پھر جو آپ پر ایمان لائے اسے خوش خبری سنائیں اور جو ایمان نہیں لاتا اسے اللہ کے عذاب سے ڈرائیں، آپ کے ذمّہ کام صرف اتنا ہی کیا گیا ہے، اگر آپ کی تبلیغ کے بعد بھی کوئی کفر کرتا ہے تو اس کے بارے میں آپ سے کوئی سوال نہیں ہوگا، اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لیکن بعض اہلِ مدینہ نے آیت کو "وَلَا تَسْئَلْ" "ت" کے زبر اور "لام" کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ "ہم نے آپ کو خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، تاکہ آپ ہمارے پیغام کو لوگوں تک

Marfat.com

پہنچائیں، ہم نے آپ کو اس لیے نہیں بھیجا ہے کہ آپ اہلِ دوزخ کے متعلق ہم سے پوچھیں، اس لیے آپ ان کے متعلق کوئی سوال نہ کیجیے۔ ان حضرات نے آیت کی تفسیر کے سلسلے میں محمد بن کعب قرظی اور ابو عاصم سے روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ میرے والدین کہاں ہیں (جنت میں یا جہنم میں، آں حضور صؐ کے والدین کا انتقال اسلام سے پہلے ہو گیا تھا)، اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور آپ سے فرمایا گیا کہ اہلِ دوزخ کے بارے میں ہم سے سوال نہ کرو۔ چناں چہ آں حضور صؐ نے اس کے بعد کبھی ان کا ذکر نہیں کیا۔ میرے نزدیک صحیح قراءت پہلی ہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے کی آیات میں اقوام یہود و نصاریٰ کی گمراہیوں اور انبیاء کے خلاف ان کی دیدہ دلیریوں کا ذکر کیا ہے، اور پھر اپنے نبی سے ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے آپ کو خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، بس آپ میرا پیغام لوگوں کو پہنچا دیں۔ اس کے بعد آپ کی کوئی ذمہ داری نہیں، آپ سے ان کے اعمال کے بارے میں کوئی سوال نہیں ہوگا۔ آیت میں کہیں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں کہ آں حضور صؐ نے اللہ تعالیٰ سے اصحابِ جہنم کے متعلق پوچھا تھا، اس لیے اس تفسیر کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ آیت میں آپ کو اصحابِ جہنم کے متعلق سوال سے روکا گیا ہے۔

محمد بن کعب قرظی سے جو روایت اس سلسلے میں نقل کی گئی ہے وہ بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کی وفات حالتِ شرک میں ہوئی، ظاہر ہے کہ اہلِ شرک جنتی نہیں ہو سکتے، اس لیے ممکن نہیں کہ آں حضور صؐ کو اس سلسلے میں کوئی شک و شبہ رہا ہو۔ ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت میں "مَا تُسْئَلُ" ہے اور ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں "وَلَنْ تُسْأَلَ" ہے۔ ان دونوں قراءتوں کی صورت میں بھی آیت کا وہی مفہوم ہوتا ہے جسے ہم نے ترجیح دی ہے۔ "جَحِيْمُ" ایسی آگ کو کہتے ہیں جس کے شعلے بھڑک رہے ہوں۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ

اور کبھی خوش نہ ہوں گے آپ سے یہ یہود اور نہ یہ نصاریٰ جب تک کہ آپ (خدانخواستہ) اُن کے مذہب کے (بالکل)

مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ

پیرو نہ ہو جاویں آپ (صاف) کہہ دیجیے کہ (بھائی) حقیقت میں تو ہدایت کا وہی راستہ ہے جس کو خدا نے (ہدایت کا رستہ) بتلایا ہے اور اگر آپ اتباع

اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ

کرنے لگیں ان کے غلط خیالات کا علم (قطعی ثابت بالوحی) آچکنے کے بعد تو آپ کا کوئی خدا سے بچانے والا

مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ؔ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ

نہ یار نکلے نہ مددگار جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توریت و انجیل) دی بشرطیکہ وہ اس کی تلاوت (اس طرح) کرتے رہے

(۱) تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ

جس طرح کہ تلاوت کا حق ہے۔ ایسے لوگ (البتہ آپ کے) اُس (دینِ حق) پر ایمان لے آتے ہیں اور جو شخص نہ مانیگا (کسی کا نقصان کریگا) خود ہی ایسے لوگ خسارہ میں رہیں گے

ہدایت اللہ کے بتائے ہوئے راستہ میں ہے	"وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ"

Marfat.com

هُدَى اللهِ هُوَ الْهُدٰى" (اور آپ سے یہود و نصاریٰ ہرگز خوش نہ ہوں گے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے پیرو نہ ہو جائیں، آپ کہہ دیجیے کہ حقیقی ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے)۔ یعنی اے محمد! یہود و نصاریٰ کبھی آپ سے خوش ہونے والے نہیں، اس لیے انھیں خوش کرنے اور اپنے قریب لانے کی کوششیں چھوڑ دیجیے، بلکہ اس کے بجائے انھیں صرف اسکی طرف بلائیے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھیجا ہے کہ یہ دین قیم ہے اور یہی ایک راستہ ہے مختلف گروہوں اور طبقوں کے درمیان باہمی الفت و محبت اور اجتماع کا۔ یہود و نصاریٰ کا تو یہ عالم ہے کہ آپس میں وہ خود بھی ایک ایک مسئلہ پر لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں، دونوں فرقے ایک دوسرے کے عکس اور ضد ہیں۔ آپ ایک ہی وقت میں یہودی و نصرانی نہیں ہو سکتے، اور اس لیے دونوں فرقوں کو ایک وقت میں خوش بھی نہیں رکھ سکتے، اس لیے آپ ان کے طریقوں سے اپنے دامن کو بچائے رکھیے اور اللہ کی ہدایت کے ذریعہ تمام مخلوق میں الفت و محبت پیدا کیجیے اور اسی راستہ پر مضبوطی سے قائم رہیے، اس کے سوا سب کو ایک ساتھ جمع کرنے کا اور کوئی راستہ نہیں۔ "مِلَّةٌ" دین کے معنی میں ہے، اس کی جمع "مِلَلٌ" آتی ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہے کہ اے محمد! ان یہود و نصاریٰ سے، جو یہ کہتے ہیں کہ جنت میں صرف یہودی یا نصاریٰ جائیں گے، کہہ دیجیے کہ حقیقی بیان و ہدایت تو بس اللہ ہی کا بتایا ہوا راستہ ہے، پس اللہ کی کتاب کی طرف آؤ اور اس کے اس بیان و ہدایت کی روشنی میں آؤ جس سے تمام گروہوں کے اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ اس آیت سے بھی یہود و نصاریٰ کے اس دعوے کی تردید ہو گئی کہ جنت میں صرف وہی داخل ہوں گے۔

"وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ" (اور اگر آپ بعد اس علم کے جو آپ کو پہنچ چکا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگے تو آپ کے لیے اللہ کے مقابلہ میں نہ کوئی یار ہوگا نہ مددگار) یعنی اے محمد! آپ نے ان یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے کے لیے ان کی یہودیت و نصرانیت میں پیروی کر لی تو یاد رکھیے کہ آپ کے پاس ان کے کفر و ضلالت کا علم آپ کے رب کے پاس سے آچکا ہے اور ان کے تمام واقعات میں نے آپ سے بیان کر دیئے ہیں، اگر اس کے باوجود آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو کوئی بھی آپ کو میری گرفت اور میری سزا سے نہیں بچا سکے گا۔ "وَلِيٌّ" اور "نَصِيْرٌ" کا مفہوم ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ یہود و نصاریٰ نے آں حضورؐ کو اپنے دین کی طرف دعوت دی تھی، دونوں فریق نے اپنے حق ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور کہا تھا کہ ہدایت ہمارے ہی دین میں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں نصیحت کی اور حق کو سب پہ واضح کر دیا۔[۱]

"اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ" (جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے) آیت سے مراد کون لوگ ہیں؟ ائمہ مفسرین سے اس سلسلے میں مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ مراد اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ قتادہ سے منقول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے وہ علما مراد ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے تھے اور جنھوں نے توریت کے حکم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی اور آپ کی شریعت کی تصدیق کی۔ یہ قول ابن زید کا ہے۔ اور یہی آخری قول زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے کی آیتوں میں بھی

---

[۱] یہ ملحوظ رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ بات محض بطور فرض کہی گئی ہے اور اس طرز خطاب سے مقصود بھی مسئلہ کی اہمیت پر زور دینا ہے، یعنی کفار و مشرکین کی طرف میلان پر جب اتنی شدت آں حضورؐ کے ساتھ ہو سکتی ہے تو پھر دوسروں کا کیا ذکر ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں خطاب آں حضورؐ سے محض لفظاً ہے، ورنہ مراد امت اسلامی ہے اور یہ حکم اسی کو ہے۔ (مترجم)

Marfat.com

اہلِ کتاب ہی کا ذکر ہے۔ آں حضورؐ کے عام صحابہؓ کا اس سے پہلے کوئی ذکر نہیں اگر اس کے بعد بھی ان کا ذکر ہوتا تو یہ کہنا ممکن تھا کہ یہاں سے ایک نیا بیان شروع ہو رہا ہے، لیکن اس کے بعد بھی دوسرا ہی تذکرہ ہے۔ اس لیے اس آیت کو بھی اہل کتاب ہی سے متعلق قرار دیا جائے گا۔ "اَلْکِتَابَ"، الف لام اس لیے داخل کیا کہ آں حضورؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کو معلوم تھا کہ کتاب سے مراد کون سی کتاب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے محمدؐ! جن لوگوں کو ہم نے وہ کتاب دی ہے جو آپ کے بھی علم میں ہے، یعنی توریت، اور انھوں نے اس کی اتباع میں آپ کی بھی تصدیق کی، تو یہی وہ لوگ ہیں جو اس کے پڑھنے کا حق ادا کرتے ہیں "یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ" (اور وہ اسے اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح اس کے پڑھنے کا حق ہے) اس کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ "یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ"، کا مطلب یہ ہے کہ "اور وہ اس کی اتباع کرتے ہیں جس طرح اس کی اتباع کا حق ہے"۔ چنانچہ ابنِ عباس اور ابنِ مسعود رضی اللہ عنہما سے یہی روایت ہے کہ توریت میں جن چیزوں کو حلال کہا گیا ہے انھیں حلال سمجھتے ہیں اور جن چیزوں کو حرام کہا گیا ہے انھیں حرام سمجھتے ہیں اور ان میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہونے دیتے عکرمہ، عطاء، ابو رزین، مجاہد، قیس بن سعد اور قتادہ رحمہم اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ تلاوت کا حق یہ ہے کہ اس کے حلال و حرام پر عمل کیا جائے، اللہ نے جس طرح اسے نازل کیا ہے اسی کے مطابق اسے پڑھا جائے اور کسی قسم کی تحریف و تبدیلی نہ کی جائے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "تلاوت"، بمعنی اتباع قرآن مجید میں ایک جگہ اور آیا ہے، ارشاد ہے "وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰھَا"، (اور چاند کی قسم) جب وہ آفتاب کے پیچھے آئے) یہاں بھی "تلا"، کا معنی اتباع ہی ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں دوسرا قول یہ ہے کہ "اور وہ اسے اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح اس کے پڑھنے کا حق ہے"، میرے نزدیک اس کی بہتر تفسیر یہی ہے کہ اتباع کے معنی میں لیا جائے، یعنی "اور وہ اس کی اس طرح اتباع کرتے ہیں جس طرح اس کی اتباع کا حق ہے"۔ بولتے ہیں "مَازِلْتُ اَتْلُوْ اَثَرَہٗ"، یعنی "میں اس کی برابر اتباع کرتا رہا"۔ اس محاورہ میں بھی "تلاوت"، اتباع کے معنی میں ہے (اگرچہ تلاوت کا عام اور متبادر معنی پڑھنا ہی ہے)۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ہم نے نقل کیا، اس پر اجماع ہے کہ آیت میں اتباع ہی کا معنی مراد ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "اے محمدؐ! جن لوگوں کو ہم نے کتاب توریت دی ہے، ان میں سے جو آپ پر ایمان لائے اور آپ کی شریعت کی بھی تصدیق کی، یہی وہ لوگ ہیں جو میری اس کتاب کی واقعی اور حقیقی اتباع کرتے ہیں جو میں نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی تھی، یہ لوگ اس کتاب (توریت) میں آپ کی بعثت، آپ کی صفات اور آپ کے نبی بنا کر بھیجے جانے کے متعلق پڑھتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی تحریف و تبدیلی نہیں کرتے، اس میں جو چیزیں حلال کی گئی ہیں اُنھیں حلال سمجھتے ہیں، جو حرام کی گئی ہیں انھیں حرام سمجھتے ہیں اور ان سے پرہیز کرتے ہیں۔ "حَقَّ تِلَاوَتِہٖ"، ان کی اپنی کتاب کی اتباع اور اس پر عمل میں پختگی کی مزید تاکید اور مبالغہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ بولتے ہیں "فُلَانٌ لَعَالِمٌ حَقَّ عَالِمٍ"، یعنی فلاں واقعی عالم ہے، اسے عالم ہونے کا حق ہے۔ "اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ"، (وہ لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو کوئی اس سے کفر اختیار کرے گا تو یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں)۔ "یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ"، یعنی وہ لوگ اس کی تصدیق کریں گے، مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اس سے پہلے کی آیت میں ہوا کہ وہ اپنی کتاب کی اتباع کا حق ادا کرتے ہیں۔ "بِہٖ"، کی ضمیر "ہٗ"، اس سے پہلے کی آیت "تِلَاوَتِہٖ"، میں ضمیر "ہٗ"، کی طرف لوٹتی ہے، اور دونوں سے مراد وہی "کتاب"، ہے جس کا ذکر "اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ"، میں ہوا ہے یعنی توریت۔ مطلب یہ ہے کہ توریت پر واقعی جسے ایمان ہے وہی اس کے حلال و حرام احکام کی اتباع کرتا ہے اور اس کے فرائض پر عمل کرتا ہے، جو شخص ان صفات کا حامل ہے وہی اس کا مستحق ہے کہ اسے توریت پر ایمان لانے والا کہا جائے، لیکن جو شخص اس میں تحریف و تبدیلی کر لیتا ہے اور اس کے فرائض پر عمل نہیں کرتا وہ اس کا مؤمن کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ اس موقعہ پر توریت پر واقعی ایمان لانے والوں اور اس

Marfat.com

کے حلال وحرام پر عمل کرنے والوں کی تعریف اس لیے کی گئی کہ ایسے بہت سے بنی اسرائیل آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائے تھے اور آپ کی اس بنیاد پر تصدیق کی تھی کہ توریت میں اس کے ماننے والوں کو اس کا حکم تھا، آخری نبی کی علامات تھیں اور کہا گیا تھا کہ بنی اسرائیل اور تمام بنی آدم پر، جب وہ مبعوث ہوں تو ان کی اتباع فرض ہے۔ اس کے برخلاف جن لوگوں نے آں حضورؐ کی تکذیب کی، انھوں نے توریت کے مضامین اور اس کے احکام کی تکذیب کی۔ اس لیے وہ توریت پر ایمان رکھنے والے کیسے ہو سکتے ہیں؟۔

ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آیت سے مراد بنی اسرائیل کے وہ افراد ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور توریت پر ایمان لائے تھے، اس کے بالمقابل دوسرے جملے "اور جو کوئی اس سے کفر اختیار کرے گا تو یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں"، میں یہ بتایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے والا توریت کا بھی منکر ہے اور انجام کار نقصان اٹھانے والا[۱] ہے۔

يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّىۡ

اے اولادِ یعقوب (علیہ السلام) میری ان نعمتوں کو یاد کرو جن کا میں نے تم پر (وقتاً فوقتاً) انعام کیا اور اس کو (بھی) کہ

فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ○ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ

میں نے تم کو (بہت سی باتوں میں) بہت لوگوں پر فوقیت دی۔ اور تم ڈرو ایسے دن سے جس میں کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے نہ کوئی مطالبہ

نَّفۡسٍ شَيۡـًٔـا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ

(حق واجب) ادا کرنے پائیگا اور نہ کسی کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جاویگا اور نہ کسی کو کوئی سفارش (جبکہ ایمان نہ ہو) مفید ہوگی

وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ○

اور نہ ان لوگوں کو کوئی بچا سکے گا۔

نصیحت و موعظت

"یا بَنِیٓ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ○" (اے بنی اسرائیل میری وہ نعمتیں یاد کرو جو میں نے تم کو بخشیں اور یہ کہ میں نے تم کو دنیا جہان والوں پر فضیلت دی) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان بنی اسرائیل کو نصیحت کی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے ان کے اسلاف اور آباء و اجداد پر اپنے انعامات و احسانات کا ذکر کرنے سے مقصد اپنے دین اور اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

(۱) اکثر مفسرین نے آیت میں "بہ" کی ضمیر "الکتاب" ہی کی طرف پھیری ہے، جیسا کہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ لیکن بعض حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ضمیر لوٹائی ہے، اور وہ اس طرح کہ "اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ بِالۡحَقِّ" میں آپ کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہما نے "الحق" اور "الدین" کو ضمیر کا مرجع قرار دیا ہے جس کا ذکر اس سے پہلے کی آیتوں میں ہے مفہوم سب کا ایک ہی ہے، لیکن حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رح کی تاویل کی صورت میں بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

Marfat.com

تصدیق پر انھیں آمادہ و تیار کرنا ہے۔ ارشاد ہے کہ اے بنی اسرائیل! اپنے اوپر میرے انعامات و احسانات کو یاد کرو، میں نے تمھیں فرعون اور اس کی قوم کے عذاب سے نجات دی، میدان تیہ میں جب تم بھٹکتے پھر رہے تھے تو میں نے تم پر من و سلویٰ نازل کیا، اس زمانہ میں دنیا کی تمام اقوام پر میں نے تمھیں فضیلت دی، تم اس سے پہلے مقہور و مجبور رہتے تھے، میں نے تمھیں عزت و قوت اور حکومت بخشی، یہ سب کچھ اس وجہ سے تھا کہ اس زمانہ میں تم میری طاعت کرتے تھے، میرے رسول اور میرے دین کی اتباع کرتے تھے۔ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات کی تفصیلات گذشتہ صفحات میں بہت آچکی ہیں۔ اس لیے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

"وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ"

اس آیت میں انھیں لوگوں کو ڈرایا گیا ہے جنھیں اس سے پہلے کی آیت میں نصیحت کی گئی تھی، یعنی اے بنی اسرائیل جنھوں نے میری کتاب میں تحریف و تبدیلی کر ڈالی اور میرے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا، اس دن کے عذاب سے ڈرو جب نہ کوئی کسی کے کچھ کام آئے گا اور نہ کوئی کسی کو بچا سکے گا، تم نے جو کچھ اس دنیا میں کفر و انکار اور میرے رسول کی تکذیب کی ہے اس کی وجہ سے تم عذاب میں ڈالے جاؤ گے، کسی کی طرف سے کوئی فدیہ اور تاوان قبول نہیں کیا جائے گا جس پر کوئی حق واجب ہے، اس کے حق میں کسی کی شفاعت نہیں قبول کی جائے گی اور جب اللہ تعالیٰ گنہگاروں سے ان کے گناہوں کا بدلہ لیں گے تو کوئی ان کی مدد نہیں کر سکے گا۔ اس مضمون کی آیات کی تفسیر گذر چکی ہے۔

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي

اور جس وقت امتحان کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اُن کے پروردگار نے چند باتوں میں اور وہ ان کو پورے طور سے بجا لائے (اس وقت) حق تعالیٰ

جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ

نے ان سے فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا مقتدا بناؤں گا — انھوں نے عرض کیا اور میری اولاد میں سے بھی (کسی کسی کو نبوت دیجیے)، ارشاد ہوا

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ

کہ میرا (یہ) عہدہ (نبوت) خلاف ورزی (قانون) کرنیوالوں کو نہ ملیگا

ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش

"وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ" (اور جب[1] ابراہیم ع کو ان کے پروردگار نے چند اُمور میں آزمایا) "اِبْتَلٰی" بمعنی آزمایا۔ بولتے ہیں "اِبْتَلَيْتُ فُلَانًا" یعنی میں نے

[1] ابراہیم علیہ السلام اسلامی عقیدہ کے علاوہ، یہود و نصاریٰ کے یہاں بھی بڑے جلیل القدر پیغمبر مانے جاتے ہیں۔ مشرکین عرب کے یہاں بھی آپ کی شخصیت مسلّم تھی۔ نئی تحقیقات کے مطابق آپ کا سنہ پیدائش ۲۱۶۰ ق م ہے۔ عمر توریت کے بیان کے مطابق ۱۷۵ سال ہے۔ والد کا نام "تارح" تھا، جس کا عربی تلفظ "آزر" ہے۔ آبائی وطن ملک بابل تھا، جو اب نئے جغرافیہ میں عراق ہے۔ جس شہر میں آپ کی ولادت ہوئی اس کا نام توریت میں "اُور" (UR) آیا ہے۔ اسی صدی میں یہ شہر ماہرین آثار قدیمہ کی کھدائی کے نتیجہ میں نمودار ہوا ہے۔ (باقی بر صفحہ ۵۶)

Marfat.com

فلاں کو آزمایا۔ ایک موقعہ پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى" یعنی یتیموں کو آزمالیا کرو۔ ابراہیم علیہ السلام کے لیئے اللہ تعالیٰ کی آزمائش یہ تھی کہ آپ پر کچھ چیزیں فرض کی گئی تھیں اور کچھ چیزوں کا آپ کو حکم ہوا تھا، یہی وہ کلمات (امور) تھے جن کی وحی اللہ نے آپ پر کی اور بطور امتحان ان پر عمل کا آپ کو مکلف ٹھہرایا۔ "کلمات" کی تفسیر کے سلسلے میں مفسرین کے کئی ...... اقوال نقل ہوئے ہیں۔

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مراد شرائع اسلام ہیں، آپ نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کے سوا کوئی ایسا نہیں جسے اس دین کے معاملہ میں آزمایا گیا ہو اور وہ پورا اترا ہو اور کل دین کو اس نے قائم کیا ہو۔ صرف ابراہیم علیہ السلام وہ ہیں جنھیں اسلام کے ذریعہ آزمایا گیا اور آپ اس میں پورے اترے۔ آپ نے فرمایا کہ اسلام کے تیس اجزاء ہیں، دس کا ذکر سورۂ برارت میں ہے، دس کا ذکر سورۂ احزاب میں ہے اور دس کا ذکر سورۂ مومنین میں ہے۔ اس آزمائش میں پورا اتر جانے کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیئے آگ سے برارت لکھدی۔

دوسرا قول خود ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس سلسلے میں یہ نقل ہے کہ مراد دس عادتیں ہیں جو سنن اسلام میں سے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ نے آپ کو طہارت کے ذریعہ آزمایا تھا جن میں سے پانچ کا تعلق سر سے اور پانچ کا جسم کے باقی حصّوں سے تھا، سر کی طہارت میں مونچھ ترشوانا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مسواک کرنا اور سر کے بیچ سے مانگ نکالنا جسم کے باقی حصّوں کی طہارت میں ناخن ترشوانا، موئے زیرناف مونڈنا، ختنہ کرنا، بغل کے بال منڈوانا اور اجابت کے بعد پانی سے آب دست لینا اور پیشاب کے بعد بھی پانی سے استنجا کرنا۔ یہ تفسیر قتادہ اور ابوالخلد سے بھی مروی ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ جن کلمات (امور) میں آپ کو آزمایا گیا تھا وہ تھے تو دس ہی خصائل، لیکن ان میں بعض کا تعلق طہارت جسم سے تھا اور بعض کا تعلق مناسک حج سے تھا۔ یہ قول بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ان میں سے چھ کا تعلق انسانی جسم کی طہارت سے ہے اور چار مناسکِ حج سے متعلق ہیں، جسمانی طہارت میں موئے زیرناف مونڈنا، ختنہ کرانا، بغل کے بال بنوانا، ناخن ترشوانا، مونچھ کے بال بنوانا اور جمعہ کے دن غسل کرنا۔ مناسک سے متعلق چار چیزیں طواف، صفا اور مروہ کے درمیان سعی، رمی جمار اور عرفات سے واپسی ہے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ "کلمات" سے مناسکِ حج اور آگے کی آیت میں "میں یقیناً تمھیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں" مراد ہیں، یعنی ان سب چیزوں میں ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کی گئی تھی۔ یہ قول ابوصالح، مجاہد، ربیع رحمہم اللہ اور ایک قول میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ ربیع، مجاہد رحمۃ اللہ علیہما نے اس کی مزید تفصیل اس طرح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے ارشاد فرمایا، میں تمھیں چند کلمات میں آزمانے والا ہوں، تمھیں معلوم بھی ہے کہ وہ کیا ہیں؟۔ اور پھر ان کی تفصیلات آگے کی آیات میں نقل ہوئی ہیں جن میں آپ کو آزمایا گیا تھا، یعنی "میں یقیناً تمھیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں، عرض کی، اور میری نسل سے بھی؟ فرمایا کہ میرا وعدہ نافرمانوں کو نہیں پہنچتا"۔ اس کے بعد ارشاد "اور جب ہم نے خانۂ کعبہ کو ایک مقام رجوع اور مقام امن بنا دیا" اور "مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو" اور "ہم

(بقیہ حاشیہ ص۵۵) ۔ یہ شہر خلیج فارس کے دہانہ فرات اور عراق کے پایہ تخت بغداد کے تقریباً درمیانی مسافت پر واقع ہے۔ آپ کی نسل کے دو سلسلے یعنی بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل (عرب) ہیں۔ دونوں میں ایک طرح کی رقابت و چشمک مدتوں سے چلی آرہی تھی۔ اب اللہ کی نعمت خاص یعنی توحید کی علمبرداری نسل اسرائیل سے چھن کر ایک اسماعیلی پیغمبر کے واسطہ سے ساری دنیا کے لیئے عام ہو رہی تھی، اس لیئے بنی اسرائیل کے تذکرہ اور ان کی ان نافرمانیوں اور سرکشیوں کی تفصیلات کے بعد جن کی وجہ سے ان کا یہ امتیاز ان سے چھنا تھا، ضرورت تھی کہ ابراہیم علیہ السلام اور ضمن میں اسماعیل علیہ السلام کی شخصیت کی مرکزیت و اہمیت سے دنیا کو روشناس کیا جائے۔

Marfat.com

نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی طرف حکم بھیجا کہ تم دونوں میرے گھر کو پاک صاف رکھو" اور اسی سلسلے کی دوسری آیتیں۔
پانچواں قول یہ ہے کہ صرف مناسکِ حج اس سے مراد ہیں۔ یہ قول بھی ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔
چھٹا قول یہ ہے کہ "کلمات" سے بہت سے امور مراد ہیں جن میں ایک ختنہ کرانا بھی ہے۔ اس کی روایت شعبی سے ہے۔
ساتواں قول یہ ہے کہ "کلمات" جن میں آپ کی آزمائش ہوئی تھی، ان سے مراد چھ چیزیں ہیں، ستارے، چاند، سورج، آگ، ہجرت اور ختنہ۔ انھیں چھ چیزوں میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو آزمایا تھا۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ وضاحت کے ساتھ یہ روایت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کے واسطہ سے منقول ہے کہ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو چند امور میں آزمایا تھا اور آپ صبر و استقامت میں پورے اترے تھے، آپ کو ستارے، چاند اور سورج کے ذریعہ آزمایا گیا، لیکن آپ اس میں پورے اترے اور آپ نے پہچان لیا کہ رب العالمین ہمیشہ رہنے والا ہے اور اس پر کبھی زوال نہیں طاری ہوگا، چنانچہ آپ نے اپنا چہرہ اس ذاتِ گرامی کی طرف مخلص ہوکر پھیر دیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور آپ مشرکین میں سے نہیں تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہجرت کے ذریعہ آزمایا، اور آپ اپنے ملک و قوم سے اللہ کے راستہ میں نکل کر شام چلے گئے۔ ہجرت سے پہلے آپ کو آگ کے ذریعہ ...... آزمایا گیا تھا اور آپ ان سب آزمائشوں میں پورے اترے تھے۔ اس کے بعد آپ کو اپنے بیٹے کے ذبح کا حکم دے کر آزمایا گیا اور آپ اس میں بھی پورے اترے۔ آیت میں "کلمات" سے مراد یہ سب چیزیں ہیں۔ میرے نزدیک آیت کی بہتر تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کو چند "کلمات" (امور) میں آزمایا تھا یعنی ان چند امور کا آپ کو وحی کے ذریعہ حکم دیا کہ آپ اس پر عمل کریں، اور آپ اس آزمائش میں پورے اترے۔ ممکن ہے آیت میں مذکور "کلمات" سے وہ تمام ہی چیزیں مراد ہوں جن کا ذکر اوپر کی مختلف روایتوں میں متفرق طور پر آیا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ امور ہوں اور صرف انھیں میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی آزمائش کی ہو۔ بہرحال وہ "کلمات" کیا تھے اور کتنے تھے، اس کی تعیین قرآن نے نہیں کی ہے، اس لیے کسی کے لیے یہ مناسب بھی نہیں کہ متعین کر کے کہدے کہ فلاں فلاں امور ہیں جن میں آپ کو آزمایا گیا تھا، کیونکہ ہمارے پاس اس کی تعیین کے لیے کوئی قابلِ اعتماد ذریعہ نہیں ہے۔ حدیث یا اجماعِ امت بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث نقل کی جاتی ہے۔ اس کے راوی انس رضی اللہ عنہ ہیں۔ آں حضورؐ نے فرمایا تمھیں معلوم ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ کیوں کہا گیا ہے کہ "انھوں نے پورا کر دکھایا تھا"؟ پھر ...... آپ نے خود ہی فرمایا کہ آپ ہر صبح و شام یہ پڑھا کرتے تھے "فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ" (سو

لہ یہ قرآن مجید سے ...... اقتباس ہے۔ نبوت سے پہلے جب ابراہیم علیہ السلام کو اللہ رب العزت کی حقیقی معرفت نہیں حاصل تھی تو آپؑ نے چاند اور ستاروں کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ یہ میرے رب ہیں، لیکن جب وہ ڈوب گئے اور سورج نکلا تو فرمایا کہ یہ بڑا ہے اور زیادہ روشن بھی، میرا رب یہی ہے لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں ڈوبنے والے کو پسند نہیں کرتا، پھر آپ نے فرمایا کہ دنیا کی پالنے والی ذات تو وہی ہو سکتی ہے جس پر کبھی زوال نہ آئے جو ازلی و ابدی ہو۔ اور اس طرح آپ کو اللہ رب العزت کی معرفت حاصل ہوتی تھی۔ مذکورہ قول میں گویا یہ ایک امتحان تھا جس میں آپ پورے اترے۔ دوسری آزمائش وہ تھی جب آپ اپنے باپ اور اپنی قوم کی اذیتوں سے تنگ ہوکر ہجرت پر مجبور ہو گئے تھے۔ ہجرت سے پہلے آپ کو تبلیغِ دین کی سزا میں نمرود کے حکم سے آگ میں ڈالا گیا تھا۔ ایک آزمائش آپ کو اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کا حکم دے کر ہوئی تھی۔ بعض روایتوں میں اسی ضمن میں ختنہ کا بھی ذکر ہے جس کا حکم آپ کو بلوغ کے بعد ہوا تھا۔

Marfat.com

اللہ کی تسبیح کیا کرو شام کے وقت بھی اور صبح کے وقت بھی اور آسمانوں اور زمین میں حمد اسی کی ہوتی ہے اور بعد زوال بھی اور ظہر کے وقت بھی)۔

ایک اور روایت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے نقل ہے کہ تمھیں معلوم ہے ابراہیم علیہ السلام نے کیا چیز پوری کر دکھائی تھی؟ صحابہ رضی نے عرض کی کہ اللہ اور اس کے رسول جاننے والے ہیں۔ فرمایا کہ آپ نے روزانہ کا اپنا وظیفہ عمل پورا کر دکھایا تھا، روزانہ دن میں آپ چار رکعت پڑھا کرتے تھے۔ اگر ان دونوں روایتوں کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ان میں سے ہر ایک کے مطابق الگ الگ دو طرح کے عمل کی نشاندہی ہوتی ہے، جنھیں ابراہیم علیہ السلام نے پورا کر دکھایا تھا۔ لیکن ان دونوں روایتوں کی سند کی صحت میں مجھے تامل ہے اور اس سلسلے میں جو مناسب تفسیر ہو سکتی تھی وہ ہم نے بیان کر دی۔ البتہ مجاہد، ابو صالح اور ربیع رحمہم اللہ سے منقول تفسیر کے لئے گنجائش ہے، کیونکہ ان کے قول کے مطابق اس آیت کے بعد کی آیتیں ان "کلمات" کی تعیین کرتی ہیں اور ان آیتوں میں ان امور (کلمات) کی نشاندہی کی گئی ہے جس کا ذکر زیر تفسیر آیت میں ہے "فَاَتَمَّهُنَّ" یعنی پھر ابراہیم علیہ السلام نے ان کلمات کو پورا کر دکھایا۔ انھیں پورا کرنے کی صورت یہ تھی کہ اللہ کے حکم کے مطابق عملاً اسے کر دکھایا۔ اسی کا ذکر ایک دوسری آیت میں ہے کہ "اور ابراہیم جنھوں نے پورا کر دکھایا"، یعنی جن امور کی انجام دہی آپ کے سپرد کی گئی تھی اسے انجام دیا۔ یہی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ اور ربیع رحمہما اللہ سے منقول ہے۔

"قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" یعنی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے ابراہیم، میں یقیناً تمھیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں، پیشوا (امامًا) وہ ہے جس کی اقتدار کی جاتی ہے، جس کے پیچھے چلا جاتا ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے یہی مفہوم نقل ہوا ہے مصدر ہے اَمًّا وَ اِمَامَةً سے بولتے ہیں "اَمَمْتُ الْقَوْمَ" یعنی میں نے قوم کی پیشوائی کی۔ ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ مجھ پر اور میرے انبیاء پر ایمان لانے والے جو لوگ تمہارے بعد آئیں گے، ان سب کا میں تمھیں پیشوا بنانے والا ہوں، تاکہ سب تمہارے طریقے کو اپنائیں اور میری وحی اور حکم کے مطابق جو اعمال تم نے کیے ہیں سب اس کی اتباع کریں۔

"قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ" (کہا اور میری نسل سے بھی؟) یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو رفعت و منزلت عطا فرمائی اور انھیں بتا دیا کہ میں تمھیں تمہارے زمانہ اور اس کے بعد کے تمام انسانوں کا امور خیر میں..... پیشوا بنانے والا ہوں، تو آپ نے عرض کی کہ اے رب! جس طرح آپ نے مجھے پیشوائی عطا فرمائی، میری نسل کو بھی پیشوائی عطا فرمائیے۔ ربیع رحمہ سے یہی روایت ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس جملہ میں ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے صرف اس کی دعا کی ہے کہ آپ کی نسل کو آپ ہی کے دین اور طریقہ پر باقی اور قائم رکھے۔ لیکن یہ مفہوم آیت کی ترتیب سے جوڑ نہیں کھاتا۔

"قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ" (فرمایا کہ میرا وعدہ نافرمانوں کو نہیں پہنچتا) اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع دی جا رہی ہے کہ اصحاب خیر کی امامت و پیشوائی ظالم کو نہیں دی جاتی۔ ابراہیم علیہ السلام نے ایک سوال کیا تھا کہ امامت و پیشوائی میں میری نسل کو بھی شریک کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں ارشاد فرماتا ہے کہ وہ ایسا کرے گا اور آپ کی نسل کے افراد کو بھی یہ مرتبہ عطا کرے گا، لیکن سب کو نہیں، جو لوگ ظالم ہوں گے انھیں یہ مرتبہ نہیں حاصل ہو سکتا، کیونکہ امامت و پیشوائی صرف اللہ کے دلیوں اور اطاعت گذار بندوں کو ملتی ہے۔

آیت میں مذکور "عہد" کے سلسلے میں مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں کہ اس سے مراد کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ مراد نبوت ہے۔ سدی سے یہی منقول ہے۔ اس معنی کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ظالم و مشرک کو نبوت نہیں مل سکتی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد پیشوائی اور امامت کا وعدہ ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے بعد تمہاری

Marfat.com

نسل میں جو لوگ ظالم ہوں گے انھیں میرے بندوں کی پیشوائی کا مرتبہ نہیں حاصل ہو سکتا۔ یہ قول مجاہد اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہما سے منقول ہے۔ عطار نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے "عہد" سے مراد اس کا "امر" ہے۔ آیت کی تفسیر میں تیسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہوا ہے کہ ظالموں سے کیا ہوا عہد و پیمان توڑا جا سکتا ہے، یعنی اگر تم نے کسی ظالم حکمراں سے بیعت اور عہد کیا ہو تو اس کے مظالم کے مشاہدے کے بعد وفائے عہد کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، بلکہ تمھیں اس کی بیعت فسخ کر دینی چاہیے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ آیت میں "عہد" سے مراد "امان" ہے۔ آیت کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ میرے دشمنوں اور میرے بندوں پر ظلم کرنے والوں کو میری امان نہیں ملے گی، یعنی قیامت میں آخرت کے عذاب سے وہ بچ نہیں سکتے۔ یہ قول قتادہ اور ابراہیم رحمہما اللہ کا ہے۔ آپ حضرات نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ ظالموں کو اگرچہ دنیا میں امن حاصل ہے اور وہ یہاں عیش و آرام کر رہے ہیں، لیکن آخرت میں انھیں امان نہیں ملے گی۔

پانچواں قول یہ ہے کہ "عہد" سے مراد اللہ کا دین ہے۔ ربیع اور ضحاک رحمہما اللہ سے یہی قول نقل ہوا ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس آیت کا مضمون ایک دوسرے موقعہ پر بھی بیان ہوا ہے، ارشاد ہے "اور ہم نے ابراہیم پر اور اسحاق پر برکتیں نازل کیں اور ان دونوں کی نسل میں بعض اچھے بھی ہیں اور بعض صریحاً اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں"، مطلب یہ ہے کہ اے ابراہیم تمہاری تمام نسل حق پر نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ بظاہر اس آیت میں ابراہیم علیہ السلام کو صرف اس کی اطلاع دی گئی ہے کہ اللہ کا عہد ظالموں اور صحیح راستہ سے تجاوز کرنے والوں کو نہیں پہنچ سکتا لیکن ضمناً اس سے یہ مفہوم بھی خود بخود نکلتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں ایسے لوگ آئندہ پیدا ہوں گے جو ظالم و مشرک ہوں گے۔ چنانچہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مفہوم بھی منقول ہے۔ آیت میں "الظالمین" کو نصب ہے، ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرات میں یہ رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ جائز دونوں ہیں، کیونکہ "نَالَنِیْ خَیْرٌ" (مجھے خیر حاصل ہو گئی، مل گئی) بھی بولتے ہیں اور "نِلْتُ خَیْرًا" (میں نے خیر کو پا لیا، حاصل کر لیا) بھی استعمال ہوتا ہے۔ "ظلم" کا مفہوم ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا

اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے کہ) جس وقت ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا معبد اور (مقام) امن (ہمیشہ کے لیے) مقرر کیا اور مقام ابراہیمؑ کو

مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ

(کبھی کبھی) نماز پڑھنے کی جگہ بنا لیا کرو اور ہم نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیل (علیہما السلام) کی طرف حکم بھیجا

اَنْ طَهِّرَا بَيْتِیَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○

کہ میرے (اس) گھر کو خوب پاک رکھا کرو بیرونی اور مقامی لوگوں (کی عبادت) کے واسطے اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے۔

خانہ کعبہ، مرجع خلائق اور مقام امن

"وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ" یہ جملہ اس سے پہلے والے جملے "وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ" پر عطف ہے اور یہ "يٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ" پر عطف ہے، معنی یہ ہوگا کہ "اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مقام رجوع بنایا"۔ "البیت" سے مراد بیت الحرام (خانہ کعبہ) ہے "مَثَابَة" "مَفْعَلَة" کے وزن پر ہے، "اَلْقَوْمُ اِلٰى مَوْضِعِ فُلَانٍ" لوگ فلاں جگہ واپس

Marfat.com

آ گئے"۔ سے نکلا ہے، آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لوٹ کر آنے کی جگہ، مرجع خلائق اور پناہ گاہ بنایا، کہ لوگ ہر سال وہاں آتے ہیں اور پھر بھی ان کا دل نہیں بھرتا"۔ بولتے ہیں "ثَابَ اِلَیْہِ عَقْلُہٗ"، یعنی فلاں کی عقل چلی جانے کے بعد پھر واپس آ گئی۔ ہم نے جو مفہوم اس کا بیان کیا ہے وہی مجاہد، سدی، ابولبابہ، عطاء، عطیہ، سعید بن جبیر، قتادہ، ربیع اور ابنِ زید رحمہم اللہ سے بھی منقول ہے۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے بھی یہی معنی بیان کیے۔ "وَ اَمْنًا" (اور مقامِ امن) "امن"، مصدر ہے، اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو "امن" اس لیے کہا کہ یہ گھر جاہلیت میں بھی لوگوں کے لیے جائے پناہ تھا، اگر وہاں کسی کو اس کے باپ یا بھائی کا قاتل بھی مل جاتا تو اس سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا، کوئی اقدام یا حملہ وغیرہ حدودِ حرم سے باہر نکلنے کے بعد ہی کر سکتا تھا۔

ایک دوسرے موقعہ پر قرآن مجید میں خود اس کے متعلق آیا ہے کہ "کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم نے حرم کو مقامِ امن بنایا ہے، جبکہ اس کے اردگرد سے لوگ اُچک لیے جاتے ہیں[1]"، ابنِ زید، سُدّی، مجاہد اور ربیع رحمہم اللہ سے اس کا وہی مفہوم نقل ہوا ہے جو ہم نے بیان کیا۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول نقل ہوا ہے۔

"وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھِیْمَ مُصَلًّی" (اور مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو)۔ کوفہ، بصرہ، مصر اور مکہ کے عام علماء قرارت اور بعض مدینہ کے علماء نے آیت میں "اِتَّخِذُوْا"، کو "خاء" کے زیر کے ساتھ امر کا صیغہ پڑھا ہے (بمعنی بنالو)۔ اس قرارت کی بنیاد عمر رضی اللہ عنہ سے منقول حدیث پر ہے، آپ نے بیان کیا کہ میں نے عرض کی، یا رسول اللہ! کاش آپ مقامِ ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنا لیتے۔ اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ ان علماء قرارت کا کہنا ہے کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم کرنے کے لیے نازل کی تھی کہ مقامِ ابراہیمؑ کو نماز کی جگہ بنالو۔ اس لیے جبکہ یہ امر ہے، اس کی قرارت خبر کے طور پر جائز نہیں ہو سکتی۔ لیکن بصرہ کے بعض علماء نحو اس آیت کو "یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا" پر عطف قرار دیتے ہیں۔ گویا اس قول کی بنیاد پر آیت میں مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بنانے کا حکم ان بنی اسرائیل کو ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے اور جن سے اس سے پہلے کہا جا چکا ہے کہ "تم میری وہ نعمتیں یاد کرو جو میں نے تم کو بخشی ہیں"۔

چنانچہ .... ابوجعفر سے روایت ہے کہ جن کلمات کے ذریعہ ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا گیا تھا ان میں ایک یہ بھی تھا کہ "مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو"، اس میں اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا تھا اور وہ اس کے مطابق مقامِ ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ مدینہ اور شام کے بعض علماء قرارت اسے "وَاتَّخَذُوْا" "خاء" کے زبر کے ساتھ، خبر کے طور پر پڑھتے ہیں۔ لیکن صحیح پہلا ہی قول ہے، کیونکہ اس کی تائید میں حدیث موجود ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح پڑھا۔ آیت میں دوسرا لفظ "مَقَامِ اِبْرٰھِیْمَ" ہے۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کل مقاماتِ حج مقامِ ابراہیمؑ ہیں۔ مجاہد اور عطاء سے بھی یہی قول منقول ہے۔ دوسرا قول جو ابی رباح اور شعبی سے نقل ہے، یہ ہے کہ اس سے مراد عرفہ، مزدلفہ اور جمار (جہاں کنکریاں ماری ہوتی ہیں) ہیں۔ مجاہد اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اس قول کی روایت ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت میں یہ نقل ہوا ہے کہ مقامِ ابراہیم حدودِ حرم کو کہتے ہیں۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ مقامِ ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ اسماعیل علیہ السلام نیچے سے پتھر دیتے جاتے تھے اور ابراہیم علیہ السلام خانہ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے۔

---

[1] یعنی عرب جاہلیت کی غیر محفوظ اور بدویانہ زندگی میں بھی حدودِ حرم میں کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ جب کہ حالت یہ تھی کہ حدودِ حرم سے باہر نکلتے تو عام بدامنی اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔

دونوں حضرات ساتھ ساتھ یہ دعا پڑھتے جاتے تھے کہ "اے ہمارے رب! ہماری طرف سے قبول کیجیے، بے شک آپ سننے والے، جاننے والے ہیں"۔ جب دیوار کچھ اونچی ہوئی تو ابراہیم علیہ السلام کے لیے پتھر اٹھا کر اوپر رکھنا دشوار ہو گیا۔ اس وقت آپ سہولت کے لیے ایک پتھر پر کھڑے ہو کر تعمیر کرنے لگے۔ اس سلسلے میں آخری قول یہ ہے کہ مقام ابراہیم سے مسجد حرام میں وہ خاص جگہ مراد ہے جو اسی نام سے مشہور ہے۔ قتادہ، ربیع اور سدی سے یہی روایت ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آیت میں حکم اس کا ہے کہ وہاں نماز پڑھی جائے، اسے چھونے کا ہمیں حکم نہیں ہوا ہے۔ اس امتِ محمدیہ کو بھی بعض ان چیزوں کا مکلف قرار دیا گیا ہے جن کا مکلف اس سے پہلے کی امتوں کو قرار دیا گیا تھا۔ ہم سے بعض ان لوگوں نے بیان کیا جنھوں نے ابراہیم علیہ السلام کی ایڑی اور انگلیوں کا نشان اس پتھر پر دیکھا تھا۔ پھر اس امت کے لوگ اس جگہ پر ہاتھ پھیرتے اور چھوتے رہے، یہاں تک کہ وہ نشان مٹ گیا۔ صحیح قول یہی آخری ہے یعنی یہ کہ مقام ابراہیم وہی جگہ ہے جو اس نام سے مشہور ہے (اور خانہ کعبہ کا ایک جزء ہے)۔ اس کی تائید جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے، آپ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے) رکن کا استلام کیا، پھر آپ نے طواف کے تین چکروں میں رمل کیا اور چار چکروں میں معمول کے مطابق چلے۔ اس کے بعد آپ مقام ابراہیم کے پاس پہنچے اور مذکورہ بالا آیت "وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى" پڑھی۔ پھر آپ اس طرح کھڑے ہوئے کہ مقام ابراہیم آپ کے اور خانہ کعبہ کے درمیان میں آ گیا اور آپ نے اسی طرح وہاں دو رکعت نماز پڑھی۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مقام ابراہیم سے وہی خاص جگہ مراد ہے جو اسی نام سے مشہور ہے، اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جب اس نام سے ایک خاص جگہ مشہور و معروف ہے تو مقام ابراہیم کے تعین میں دوسرے غیر ضروری اقوال سے بلا کسی دلیل کے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ آیت میں لفظ "مُصَلًّى" کی تفسیر میں بھی کئی اقوال ہیں۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس کے معنی "دعا کی جگہ" کے ہیں، یعنی مقام ابراہیم کو "دعا کی جگہ" بناؤ۔ لیکن دوسرا قول یہ ہے کہ اس کے معنی "نماز کی جگہ" کے ہیں، یعنی مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھا کرو، اور اسے نماز کی جگہ بناؤ۔ یہ قول قتادہ اور سدی رحمہما اللہ سے نقل ہے۔ اگر "مُصَلًّى" کو "دعا کی جگہ" کے معنی میں لیا جائے تو یہ "صَلَّيْتُ" بمعنی "میں نے بلایا" سے ماخوذ ہوگا، مُفَعَّلٌ کے وزن پر۔ جن حضرات نے اس معنی میں لیا ہے انھیں کا یہ بھی قول ہے کہ "مقام ابراہیم" سے تمام مقاماتِ حج مراد ہیں۔ اس تفسیر کی بنیاد پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ "مقام ابراہیم یعنی عرفہ، مزدلفہ، منیٰ، جمار اور تمام مقاماتِ حج جہاں ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے، سب کو دعا کی جگہ بناؤ، جہاں مجھ سے دعا کرو، مجھے پکارو اور اس طرح میرے خلیل ابراہیم کی اقتدا کرو، کہ میں نے انھیں ان کے بعد آنے والے تمام طاعت گزار بندوں کا پیشوا بنایا ہے۔"

دوسرے قول کی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "اے لوگو! مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ، وہاں میری عبادت کے لیے نماز پڑھا کرو، یہ سنت میری طرف سے ابراہیم کی عزت افزائی کے طور پر قائم کی جاتی ہے۔ یہی قول بہتر ہے، جیسا کہ اس کی تائید میں ہم نے عمر بن خطاب اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم کی احادیث پہلے بیان کر چکے ہیں۔

"وَعَهِدْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ (اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیلؑ[1] کو حکم بھیجا کہ تم دونوں میرے گھر کو پاک

---

[1] اسماعیل علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام کے فرزند ہیں، آپ کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا شاہِ مصر کی صاحبزادی تھیں۔ مصر کا شاہی خاندان حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے خاندان کی ایک شاخ تھا اور اپنے جدی ملک عراق سے منتقل ہو کر مصر میں آباد ہو گیا تھا (باقی بر صفحہ ۶۲)

Marfat.com

صاف رکھو) ”عَہِدْنَا“، یعنی ”ہم نے حکم دیا“۔ ابن جریج اور ابن زید رحمہما اللہ سے یہ قول نقل ہوا ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ ہم نے ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کو اپنے گھر کو پاک صاف رکھنے کا حکم دیا۔ تطہیر سے آیت میں مراد خانہ کعبہ کو بتوں سے، ان کی پرستش سے اور شرک سے پاک رکھنا ہے۔ البتہ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ابراہیم علیہ السلام کے خانہ کعبہ کی تعمیر سے پہلے بھی حدود حرم میں کسی خانۂ خدا کی تعمیر موجود تھی کہ آپ کو اسے پاک رکھنے کا حکم دیا جا رہا ہے؟ اس کا جواب دو طرح دیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ”ہم نے ابراہیم واسماعیل کو حکم دیا کہ تم دونوں میرے گھر کو شرک وریب کی آلودگیوں سے پاک رکھتے ہوئے اس کی تعمیر کرو“۔ جیسا کہ اسی نوعیت کا مضمون ایک دوسری آیت میں آیا ہے، ارشاد ہے ”سو آیا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے تقویٰ اور رضامندی پر رکھی وہ بہتر ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھاٹ کے کنارے پر رکھی جو گرنے ہی کو ہے۔“

یہی صورت زیر تفسیر آیت میں بھی ہے کہ ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کو اپنا گھر شرک وریب سے پاک تعمیر کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی توجیہ نقل ہوئی ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ آیت میں یہ حکم ہوا ہے کہ خانہ کعبہ جس جگہ بنایا جائے گا اسے تعمیر سے پہلے پاک صاف رکھا جائے اور تعمیر کے بعد خانہ کعبہ کو پاک صاف رکھا جائے، یعنی ان بتوں وغیرہ سے جنھیں نوح علیہ السلام کے زمانہ میں اور آپ سے پہلے اہل شرک اس میں رکھتے تھے، تاکہ آپ کا یہ عمل آپ کے بعد آنے والوں کے لیے سنت بن جائے اور پیشوا کی حیثیت سے آپ کی لوگ اس میں اقتدار کریں۔

چنانچہ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ مراد بتوں سے پاک رکھنا ہے جن کی مشرکین عبادت کرتے تھے۔ عبید بن عمر سے روایت ہے کہ آفات وریب سے پاک رکھنا مراد ہے۔ مجاہد اور قتادہ سے روایت ہے کہ شرک اور بت پرستی سے پاک رکھنا مراد ہے۔ ”لِلطَّآئِفِیْنَ“ (طواف کرنے والوں کے لیے)۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد وہ مسافر ہیں جو دور دراز سے خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت ہے کہ مراد بیت اللہ کا ہر طواف کرنے والا ہے، خواہ دور سے آئے یا وہیں کا باشندہ ہو۔ بہتر یہی آخری قول ہے، کیونکہ طواف کا معنی بھی یہی ہے، ”طائف“ اسی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے گرد چکر لگائے اور اس کا طواف کرے، اس کے برعکس کوئی شخص دور دراز سے ہی کیوں نہ آیا ہو، اگر وہ بیت اللہ کا طواف نہیں کرتا تو اسے ”طائف“ نہیں کہہ سکتے۔ ”وَالْعٰکِفِیْنَ“، یعنی اور اقامت اختیار کرنے والوں کے لیے، ”عاکف“، بمعنی مقیم آتا ہے۔ اعتکاف کرنے والے کو بھی ”مُعتکف“ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ اللہ کی رضاجوئی کے لیے ایک خاص جگہ اپنے کو روکے رکھتا ہے اور وہیں ٹھہرا رہتا ہے۔ اس سے مراد کی تعیین میں کئی اقوال ہیں۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد خانہ کعبہ میں بیٹھنے والا ہے جبکہ وہ نہ طواف کر رہا ہو اور نہ نماز پڑھ رہا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی بیت اللہ کا طواف کر رہا ہو تو اس کے لیے ”الطائفین“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، لیکن اگر کوئی وہاں بیٹھا ہوا ہو تو اس کے لیے ”العاکفین“ استعمال ہوا ہے۔ مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ سے نقل ہے کہ اس سے مراد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱) جب ابراہیم علیہ السلام ادھر سے سفر کرتے ہوئے گذرے تو شیخ قبیلہ کی حیثیت سے آپ کو شاہِ مصر نے اپنا مہمان بنایا اور رخصت کے وقت اپنی صاحبزادی کو آپ کی خدمت میں پیش کیا جو آپ کے نکاح میں آئیں۔ اسماعیل علیہ السلام کا سالِ ولادت غالباً ۲۰۷۴ق م ہے۔ سالِ وفات غالباً ۱۹۳۷ق م۔ توریت کی روایت کے مطابق عمر ۱۳۷ سال ہے۔ آپ کے بارہ فرزند ہوئے اور ان سے بارہ نسلیں چلیں۔ عرب کا مشہور اور عالی نسب قبیلہ قریش آپ ہی کی نسل سے ہے اس لیے آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی مورثِ اعلیٰ ہیں۔

Marfat.com

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مکہ کے باشندے مراد ہیں۔ سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہا اللہ سے روایت ہے کہ خانہ کعبہ میں اعتکاف کرنے والے ہیں۔ عطار رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد "نماز پڑھنے والے" ہیں۔ میرے نزدیک بہتر قول پہلا ہے جو عطار رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد وہ ہیں جو وہاں مقیم ہوں، جبکہ نماز اور طواف نہ کر رہے ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ "عاکف" کے معنی مقیم کے آتے ہیں، یعنی کسی جگہ ٹھہرنے والا، اب اس کے لیئے یہ قطعاً ضروری نہیں کہ وہاں بیٹھا ہوا ہو، کھڑا ہو، نماز پڑھ رہا ہو، طواف کر رہا ہو، کیونکہ وہ کسی بھی حالت میں ہوگا اگر وہ مقیم ہے تو اسے "عاکف" کہیں گے۔ طواف کرنے والوں اور نماز پڑھنے والوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے خود اسی آیت میں کیا ہے، اس لیئے "العاکفین" سے مراد لازمی طور پر اس کا لغوی مفہوم ہے، اسے آگے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ "وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ" (اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیئے) "رُكَّعٌ" جمع ہے، یعنی بہت سے رکوع کرنے والے، اس کا واحد "رَاكِعٌ" ہے۔ اسی طرح "سُجُوْدٌ" جمع ہے، یعنی بہت سے سجدہ کرنے والے، واحد "سَاجِدٌ" ہے۔ جیسے "قُعُوْدٌ، جُلُوْسٌ" علی الترتیب قاعد اور جالس کی جمع ہیں۔ عطار اور قتادہ رحمہا اللہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد نماز پڑھنے والے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ

اور جس وقت ابراہیم علیہ السلام نے (دعا میں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار اس کو ایک (آباد) شہر بنا دیجئے امن (و امان والا) اور اس کے بسنے والوں کو

اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

پھلوں (کی قسم) سے بھی عنایت کیجئے (اور میں) ان کو (کہتا ہوں) جو کہ ان میں سے اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہوں (باغیوں کو آپ جانیں)

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ

حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اور اس شخص کو بھی جو کہ کافر رہے سو ایسے شخص کو تھوڑے روز تو خوب آرام برتاؤں گا پھر اس کو کشاں کشاں عذاب دوزخ میں

النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○

پہنچاؤں گا اور یہ پہنچنے کی جگہ تو بہت بری ہے۔

دعاء ابراہیمی

"وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا" یعنی اور وہ وقت بھی یاد کرو جب ابراہیم نے عرض کی کہ اے میرے پروردگار اس شہر کو امن والا بنا دے۔ مطلب یہ ہے کہ ظالموں اور جابروں سے اسے امن میں رکھ کہ وہ اس شہر پر مسلط نہ ہوں اور یہاں آکر ظلم نہ ڈھائیں، اسی طرح اے اللہ! اسے اپنی سزا اور عذاب سے محفوظ و مامون رکھ کہ جس طرح دوسری نافرمان آبادیوں پر کبھی کبھی تیرا عذاب خسف (دھنسانے) اور غرق (ڈبونے) کی صورت میں نازل ہوتا ہے اس پر ایسا عذاب نازل نہ ہو، اس کے علاوہ، اے اللہ! تو اپنے غضب اور اپنی ناراضگی سے اسے محفوظ و مامون رکھ۔

چنانچہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حرم کے حدود زمین سے اوپر کی طرف عرش تک ہیں، ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ بیت اللہ آدم علیہ السلام کے ساتھ اتارا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپ سے اس وقت فرمایا تھا کہ میں اپنا گھر تمہارے ساتھ بھیجتا ہوں، اس کے ارد گرد بھی اسی طرح طواف کیا جائے گا جس طرح عرش کا طواف کیا جاتا ہے، چنانچہ آدم علیہ السلام اس کا طواف

Marfat.com

کرتے رہے اور آپ کے بعد دوسرے مؤمنین بھی اس کا طواف کرتے تھے۔ پھر جب طوفانِ نوح آیا جس میں اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کی قوم کو غرق کر دیا تھا تو خانہ کعبہ کو اٹھا لیا گیا اور اسے زمین والوں پر اس عذابِ الٰہی سے کوئی نقصان نہیں پہنچنے دیا گیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے وہ جگہ تلاش کی اور اسی قدیم بنیاد پر دوبارہ اس کی تعمیر کی۔

سوال یہ ہے کہ کیا حرم بنائے ابراہیمی سے پہلے امن والا نہیں تھا؟ اس سلسلے میں ایک قول تو یہ ہے کہ حرم اس وقت سے امن کی جگہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کیا تھا، عذابِ الٰہی یا ظالموں کی دست بُرد کا کوئی اثر کبھی اس پر نہیں ہوا۔

اس کی تائید میں ابوشریح خزاعی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے، آپ نے بیان کیا کہ فتح مکہ کے موقعہ پر قبیلہ خزاعہ کے ایک شخص نے قبیلہ ہذیل کے ایک شخص کو (حرم میں) قتل کر دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر لوگوں کو خطاب کیا اور فرمایا کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے مکہ کو اسی دن باحرمت قرار دیا تھا جب اس نے آسمان و زمین پیدا کی تھی، اس لیئے وہ قیامت تک کے لیئے اللہ کی طرف سے باحرمت شہر ہے، کسی شخص کے لیئے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہو یہ جائز نہیں کہ اس میں خون بہائے یا اس کا درخت کاٹے، آگاہ ہو جاؤ کہ میرے بعد کبھی یہ کسی کے لیئے حلال نہیں ہوگا، میرے لیئے بھی صرف آج تھوڑی دیر کے لیئے حلال ہوا تھا، آگاہ ہو جاؤ کہ اس کے بعد پھر اس کی حرمت ویسی ہی ہو گئی جیسی کہ کل تھی، ہاں، جو یہاں موجود ہیں وہ ان کو یہ پیغام پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں، اگر تم سے کوئی یہ کہے کہ اللہ کے رسول نے تو یہاں قتال کیا تھا تو تم اس سے کہہ دینا کہ اللہ نے اپنے رسول کے لیئے اسے حلال کیا تھا تمہارے لیئے نہیں کیا ہے۔ یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اختصار کے ساتھ منقول ہے۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ اسی وقت سے امن والا شہر ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین پیدا کی تھی۔ ان حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی جو دعاء آیت میں نقل ہوئی ہے اس میں آپ نے اس شہر کو ظالموں اور جابروں سے امن میں رکھنے کی دعاء نہیں کی ہے، بلکہ قحط اور خشک سالی کی آفات سے مامون و محفوظ رکھنے کی اور اس کے بسنے والوں کو پھلوں کی روزی دینے کی دعاء کی ہے، اس کے بعد کی آیات میں اس کا وضاحت کے ساتھ ذکر ہے۔

ان حضرات کے قول کے مطابق یہ دعاء ابراہیم علیہ السلام نے اس لیئے کی تھی کہ یہ ایک بے آب و گیاہ وادی تھی اور آپؑ نے اپنی نسل کو یہاں لا کر آباد کیا تھا اس لیئے اس کی دعاء مانگی کہ انھیں بھوک پیاس کی مصیبتوں سے بچائے۔ چنانچہ جب آپ وہاں اپنی زوجہ مطہرہ اور لڑکے (ھاجرہ اور اسماعیل علیہما السلام) کے ساتھ پہنچے ہیں تو سب سے پہلے آپ نے یہی دعاء کی ہے کہ "رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ"۔ اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بے زراعت میدان میں آباد کر دیا ہے، تیرے باحرمت گھر کے قریب"۔

اس آیت میں "بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ" (تیرے باحرمت گھر) کا لفظ ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے قرآن مجید نے استعمال کیا ہے، اگر وہ پہلے سے حرم نہ ہوتا تو یہ لفظ نہ استعمال کیا جاتا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعاء سے پہلے حرم دوسرے شہروں کی طرح حلال تھا، آپ کی دعاء کے بعد اسے باحرمت قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ مدینہ منورہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دوسرے شہروں کی طرح حلال تھا اور پھر آں حضورؐ کے زمانہ میں یہ شہر بھی باحرمت ہوا۔ اس کی دلیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک ارشاد ہے، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضورؐ نے فرمایا، ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کو باحرمت اور مقامِ امن بنایا تھا اور میں نے مدینہ کو، جو دو سنگلاخ میدانوں کے درمیان میں ہے، باحرمت قرار دیا، یہاں کا شکار نہ مارا جائے یہاں کا کانٹے دار درخت بھی نہ کاٹا جائے۔

Marfat.com

یہ روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، ابراہیم علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے خلیل تھے اور میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا تھا اور میں مدینہ کو جو دو سنگلاخ میدانوں کے درمیان ہے، حرم قرار دیتا ہوں، اس کے کانٹے دار درختوں کے لیے اور اس کے شکار کے لیے بھی، اس کے حدود میں جنگ کے لیے ہتھیار نہ اٹھایا جائے اور نہ یہاں کا درخت کاٹا جائے، البتہ اونٹ کے چارے کے لیے اجازت ہے۔ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے بھی اس مضمون کی روایت ہے۔ اس مضمون کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں جنھیں یہاں نقل کر کے ہم مضمون کو طول دینا نہیں چاہتے۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی زبانی قرآن مجید میں یہ دعا نقل ہوئی ہے کہ "اے اللہ میرے اس شہر کو امن والا بنا دے"، یہ دعا بغیر کسی تخصیص کے ہے۔ اس لیے اس میں کسی قسم کی قید ہم اپنی طرف سے کسی دلیل کے بغیر نہیں لگا سکتے۔

ابن عباس اور ابو شریح رضی اللہ عنہما کی روایتیں جو پہلے قول کی تائید میں پیش کی گئی تھیں ان کی سندیں محل نظر ہیں، اس لیے یہاں دلیل کے طور پر انھیں نہیں پیش کیا جا سکتا۔ میرے نزدیک درست رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کو حرم اور مقام امن تو اسی وقت بنا دیا تھا جب یہ خطہ زمین عدم سے وجود میں آیا تھا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اسی دن حرم قرار دے دیا تھا جب اس نے زمین و آسمان کی تخلیق کی تھی۔ لیکن اس حرمت کا اعلان اپنے کسی نبی یا رسول کے ذریعہ نہیں کیا تھا، البتہ اگر کوئی وہاں بُرے ارادہ سے آتا تو اللہ کے حکم سے وہ اس پر قادر نہیں ہو سکتا تھا، اسی طرح آفات اور عذاب سے بھی اسے محفوظ رکھا تھا اور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے مطابق وہاں کے باشندوں پر کسی قسم کا آسمانی عذاب یا اس طرح کی کوئی اور مصیبت نازل نہیں ہوتی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک یہی کیفیت رہی، جب آپ وہاں پہنچے اور اپنے اہل و عیال حضرت ہاجرہ اور اسماعیل علیہما السلام کو وہاں بسانا چاہا تو آپ نے اپنے رب سے اس کی دعا کی کہ اس کی حرمت کو فرض قرار دے دیا جائے، تاکہ آپ کے بعد بھی لوگ اسے باحرمت سمجھتے رہیں اور آپ کی زبان سے اس کی حرمت کے اعلان کے بعد سب لوگ اس مثال اور نمونہ کی پیروی کریں جو آپ اس سلسلے میں چھوڑیں، کہ آپ کو پیشوا بنایا گیا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کی زبانی اس شہر کی حرمت کے فرض ہونے کا باقاعدہ اعلان کیا۔ گویا پہلے بھی یہ خطہ زمین باحرمت تھا، لیکن قدرت عالم تکوینی میں، کسی حکم یا اعلان کے بغیر خود اللہ نے اس کی حرمت و حفاظت کا اہتمام کیا تھا، لیکن ابراہیم خلیل اللہ کی دعا کے بعد اس حرمت کا تعلق عالم تکلیف کے ساتھ قائم ہو گیا اور اب ہر مومن پر اس کی حرمت اور اس کے تمام لوازم کا لحاظ رکھنا فرض ہو گیا۔ اب باقاعدہ اعلان ہوتا ہے کہ یہاں کا شکار نہ مارا جائے، یہاں کا کانٹے دار درخت بھی نہ کاٹا جائے۔ اسی خاص نوعیت کی وجہ سے اس کی حرمت کی نسبت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کی گئی۔ آپ کے ذریعہ جس حرمت کا اعلان کیا گیا اب اس کا لحاظ اور اس کے مطابق عمل عبادت کا حکم رکھتا ہے، اس سے پہلے اس کی حرمت کی نوعیت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ خود ہی اس کی حفاظت فرمایا کرتے تھے اور ہر طرح کے عذاب و آفات سے اسے مامون و محفوظ علاقہ بنایا تھا۔ ہماری اس تفسیر سے دونوں فریق کی پیش کی ہوئی احادیث کی اپنے مفہوم کے اعتبار سے صحت کی صورت نکل آتی ہے۔

ابن عباس اور ابو شریح رضی اللہ عنہما کی روایت میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کو اسی دن حرم قرار دیا تھا جب اس نے چاند اور سورج کو پیدا کیا تھا۔ جابر، ابو ہریرہ اور رافع بن خدیج رضی اللہ عنہم کی حدیث میں اس کی حرمت کی نسبت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے۔ دونوں احادیث کے مضمون میں کوئی تضاد نہیں۔ جاہل ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ایک حدیث کو اگر مان لیا جائے تو دوسری حدیث کا انکار لازمی طور پر کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے تفصیل سے لکھا ہے، دونوں احادیث میں مذکور حرمت کی نوعیت قطعاً مختلف ہے اور دونوں کو بیک وقت صحیح ماننے میں کوئی تضاد نہیں پیدا ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اگر کوئی حدیث ثابت ہو جائے اور اس کی سند صحیح ہو تو ممکن نہیں کہ آپ ہی سے ثابت کسی

دوسری حدیث کے مضمون سے اس میں کوئی ٹکراؤ پیدا ہو جائے۔ آیت وہ ایے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بے زراعت میدان میں آباد کر دیا ہے، تیرے باحرمت گھر کے قریب" میں بھی تحریم کی یہی صورت ہے اور یہاں بھی تحریم کی نوعیت کے فرق کو ملحوظ رکھا ہے۔

"وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" (اور اس میں رہنے بسنے والوں کو روزی دے پھلوں سے (یعنی) ان رہنے والوں کو جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائیں)۔ یہ بھی ابراہیم علیہ السلام کی اپنے رب سے دعا ہے کہ مکہ کے مومن باشندوں کو پھلوں کی روزی دے۔ دعا میں آپ نے صرف مومنین کا ذکر کیا اور اس طرح منکروں کو اپنی دعا میں شامل نہیں کیا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی، جب ابراہیم علیہ السلام نے اس کی دعا کی تھی کہ ان کی نسل میں سے بھی پیشوا بنا، تو اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا تھا کہ تمہاری نسل میں بہت سے منکر اور ظالم بھی ہوں گے اور انھیں میرا وعدہ نہیں پہنچے گا۔ اس لیے جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ آپ کی نسل میں ظالم اور کافر بھی ہوں گے تو آپ نے اب اپنی دعا میں خود ہی صرف مومنین کا ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے تمہاری دعا قبول کی اور میں اس شہر کے مومنوں کے ساتھ منکروں اور کافروں کو بھی روزی دوں گا، لیکن کافروں کے لیے میری روزی بس تھوڑے ہی دنوں کے لیے ہوگی، جب تک دنیا میں ہیں کھا پی لیں۔ "مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" (ان میں سے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں گے) موضع نصب میں ہے اور "اَهْلَهٗ" (اہلِ مکہ) کا بیان اور اس کی وضاحت کرتا ہے، یہی صورت ایک دوسری آیت "يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ" میں ہے (یہ لوگ آپ سے حرمت والے مہینے میں جنگ کے متعلق پوچھتے ہیں)۔ یہاں بھی "قِتَالٍ فِيْهِ" بیان و وضاحت کے لیے ہے معنیٰ کے اعتبار سے الفاظ کی ترتیب اس طرح ہوگی "عَنْ قِتَالٍ فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ"۔ ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا اس لیے کی تھی کہ آپ ایک سنگلاخ وادی میں پہنچے تھے، جہاں نہ کوئی متنفس تھا نہ کھیتی اور نہ پانی کا نام و نشان، اس لیے آپ نے دعا کی کہ اس میں بسنے والوں کو پھلوں کی روزی دے اور لوگوں کی دلی توجہات اس وادی کی طرف کر دے۔

محمد بن مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ جب آپ نے یہ دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے شام سے طائف (اس بے آب و گیاہ علاقہ میں جہاں پھلوں کی پیداوار بکثرت ہے) کو اس وادی میں منتقل کر دیا۔

"قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا" (ارشاد فرمایا کہ جو کفر کرے گا میں اسے بھی کچھ دن مزے اڑانے دوں گا)۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے جواب میں یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یعنی جو لوگ کفر کریں گے انھیں بھی میں دنیا میں کچھ دنوں کے لیے مزے اڑانے دوں گا، تا آنکہ ان کی موت آ جائے گی۔ ان حضرات نے "فَاُمَتِّعُهٗ" تا کے تشدید اور عین کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے (بمعنی میں مزے اٹھانے دوں گا)۔ یہ قول ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور ابن اسحاق رحمہ اللہ سے منقول ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ بھی ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہی کا ایک جزء ہے، یعنی اپنی دعا میں پہلے آپ نے مومن کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا پھر عرض کیا کہ اے رب! کافر کو بھی بالکل محروم نہ رکھیے، اسے بھی کچھ دن مزے اٹھانے دیجیے اور پھر اسے عذاب دوزخ کی طرف بلا لیجیے۔ اس قول کی بناء پر قراءت "فَاَمْتِعْهُ" ہوگی، تاء پر تشدید نہیں ہوگی اور عین پر جزم ہوگی (بمعنی مزے اٹھانے دیجیے)۔ یہی حال اس قول کی بنیاد پر آگے کی آیت میں "ثُمَّ اضْطَرَّهٗ" راء کو فتحہ (زبر) ہوگا اور مشہور قراءت کے خلاف اس میں ہمزہ وصلی ہوگی قطعی نہیں ہوگی۔ اس قراءت میں یہ دونوں دعائیہ کلمات ہو جائیں گے۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک درست تفسیر و قراءت پہلی ہے جو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل ہوئی ہے۔ دوسری قراءت بہت غیر معروف بھی ہے اور پہلی کے مقابلہ میں عقلاً و نقلاً کمزور بھی بہت ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے ابراہیم! میں نے تمہاری دعا قبول کی اور

Marfat.com

اس شہر کے مؤمنوں کو پھلوں کی روزی عطا کی، بلکہ کفار کو بھی محروم نہیں رکھا، یہاں رہنے والے منکروں اور ظالموں کو بھی دنیا کی زندگی میں مزے اٹھانے دوں گا، لیکن جب ان کی زندگی کی گھڑیاں پوری ہو جائیں گی تو کشاں کشاں میں انھیں جہنم میں پہنچا دوں گا۔"

"فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا"، یعنی اس میں سے انھیں جو روزی میں دوں گا وہ صرف دنیاوی زندگی میں ہوگی، اس کا فائدہ وہ اپنی موت تک اٹھا سکتے ہیں۔ آیت میں پہلے ابراہیم علیہ السلام کی دُعا نقل ہوئی ہے، اس لیے جواب بھی اسی کے مطابق ہوگا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح تفسیر نقل ہوئی ہے جس طرح ہم نے بیان کی۔ بعض حضرات نے "فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا" سے دنیاوی زندگی، موت تک مراد لی ہے۔ لیکن کچھ مفسرین نے مطلب یہ بیان کیا ہے کہ میں تمھیں کفر کے مزے اٹھانے دوں گا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک۔ آپ کی بعثت کے بعد اس وادی میں کوئی شخص کفر و شرک نہیں کر سکے گا۔ آیت کے الفاظ میں اس آخری تفسیر کے لیے گنجائش تو ضرور ہے، لیکن کلام کی ترتیب اور سیاق و سباق اس کی نفی کرتے ہیں۔

"ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ" یعنی پھر میں اسے عذاب جہنم کی طرف کھینچ لاؤں گا، کشاں کشاں پہنچا دوں گا۔ "اِضْطِرَار" کے معنی زبردستی اور مجبور کرنے کے ہیں۔ "اِضْطَرَرْتُ فُلَانًا اِلٰى هٰذَا الْاَمْرِ"، یعنی فلاں کو میں نے اس کام کے لیے مجبور کر دیا۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر میں منہ کے بل انھیں عذاب جہنم کی طرف کھینچ لاؤں گا۔ "وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ"، یعنی یہ عذاب جہنم کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے، خاص طور سے جبکہ اس سے پہلے وہ دنیا کی زندگی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ "مَصِيْرُ"، "صِرْتُ مَصِيْرًا صَالِحًا (میں بڑی اچھی جگہ پہنچ گیا)" سے نکلا ہے، یہاں مراد عذاب جہنم کی جگہ ہے جہاں موت کے بعد اللہ کے منکر پہنچائے جائیں گے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا

اور جب کہ اٹھا رہے تھے ابراہیم علیہ السلام دیواریں خانہ کعبہ کی اور اسمٰعیل علیہ السلام بھی (اور یہ کہتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے

تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا

پروردگار یہ خدمت ہم سے قبول فرمائیے بلاشبہ آپ خوب سننے والے جاننے والے ہیں اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا اور زیادہ

مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا

مطیع بنا لیجیے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی جماعت (پیدا) کیجیے جو آپ کی مطیع ہو اور (نیز) ہم کو ہمارے حج

مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

(وغیرہ) کے احکام بھی بتلا دیجیے اور ہمارے حال پر (مہربانی سے) توجہ رکھیے۔ اور فی الحقیقت آپ ہی ہیں توجہ فرمانے والے مہربانی کرنے والے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ

اے ہمارے پروردگار اور اس جماعت کے اندر ان ہی میں کا ایک ایسا پیغمبر بھی مقرر کیجیے جو ان لوگوں کو آپ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

اور ان کو (آسمانی) کتاب کی اور (اس میں) خوش فہمی (حاصل کرنے) کی تعلیم دیا کریں اور ان کو پاک کر دیں۔ بلاشبہ آپ ہی ہیں غالب القدرۃ کامل الانتظام

Marfat.com

تعمیر کعبہ

"وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ" یعنی وہ وقت بھی یاد کرو جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے۔ "قَوَاعِدُ" قَاعِدَۃٌ کی جمع ہے، بمعنی بنیاد۔ اس معنی میں واحد مؤنث کی تا کے ساتھ "قاعدۃ" آتا ہے، لیکن یہی لفظ جب ایسی عورت کے لیے استعمال ہو جس کے لڑکا اور شوہر کوئی نہ ہو تو مؤنث کی تا کے بغیر صرف "قاعد" بولتے ہیں۔ جمع اس کی بھی "قواعد" ہے۔ چونکہ یہاں کوئی مذکر ہو ہی نہیں سکتا، اس لیے صیغہ کو تا تانیث کے ساتھ لانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی، جیسے "طاہر" اور "طامث" بغیر تا تانیث کے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر مذکورہ بالا لفظ "بیٹھنے" کے معنی میں استعمال ہو تو تا تانیث کا حذف جائز نہیں ہوگا، اس وقت "قاعدۃ" ہی کہنا پڑے گا۔ "قَوَاعِدُ الْبَیْتِ" یعنی گھر کی بنیاد۔ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے خانہ کعبہ کی جس بنیاد پر تعمیر کی تھی وہ بنیاد پہلے ہی سے موجود تھی یا اس کی بنیاد بھی انہیں حضرات کی رکھی ہوئی ہے؟ مفسرین کے اقوال اس سلسلے میں مختلف ہیں۔

ایک قول تو یہ ہے کہ خانہ کعبہ کی بنیاد سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے رکھی۔ پھر آپ کے بعد اس کے نشانات مٹ گئے اور عمارت و بنیاد کسی کا نشان باقی نہ رہا۔ اس کے بعد جب ابراہیم علیہ السلام آئے تو آپ نے اللہ کے حکم سے خانہ کعبہ کی نئی تعمیر آدم علیہ السلام کی بنیاد پر کی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ عطاء کی روایت میں ہے کہ آدم علیہ السلام نے عرض کی، اے رب! میں فرشتوں کی آواز نہیں سن پاتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تمہاری لغزش کا نتیجہ ہے۔ البتہ تم زمین پر اتر جاؤ اور وہاں میرا ایک گھر بناؤ۔ تم بھی اس کا طواف اسی طرح کیا کرو جس طرح تم نے ملائکہ کو میرے آسمان کے گھر (عرش) کا طواف کرتے دیکھا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر میں پانچ پہاڑوں کا پتھر استعمال کیا، جبل حراء، طور زیتا، طور سینا، جبل لبنان اور جودی۔ اس کی بنیاد میں "حرا" پہاڑی کا پتھر استعمال کیا۔ یہ تعمیر آدم علیہ السلام کی تھی۔ اس کے بعد دوبارہ اسے ابراہیم علیہ السلام نے بنایا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ خانہ کعبہ کی بنیاد اللہ تعالیٰ نے آسمان سے آدم علیہ السلام کے ساتھ زمین پر اتاری تھی، آپ اس بنیاد کے چاروں طرف اسی طرح طواف کرتے تھے جس طرح آسمان پر عرش کا طواف کرتے تھے۔ پھر نوح علیہ السلام کی قوم پر جب اللہ کا عذاب طوفان کی صورت میں آیا تو کعبہ کی یہ بنیاد آسمان پر اٹھالی گئی، اور بعد میں ابراہیم علیہ السلام نے اسی بنیاد پر خانہ کعبہ کی تعمیر کی۔ یہ قول ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ابو قلابہ، قتادہ، ابان اور عطاء بن ابی رباح رحمہم اللہ سے روایت ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جب آدم علیہ السلام کو جنت سے اتارا گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ایک گھر بھیجتا ہوں، اس کا طواف تم اسی طرح کرنا جس طرح میرے عرش کا طواف کیا جاتا ہے اور اس کے پاس نماز اسی طرح پڑھنا جس طرح میرے عرش کے پاس نماز پڑھی جاتی ہے۔ طوفان نوحؑ کے موقعہ پر یہ گھر اٹھالیا گیا تھا۔ اس کے بعد انبیاء علیہم السلام اس کے حج کے لیے آتے، لیکن اس کی جگہ کے متعلق انہیں علم نہ ہوتا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کی جگہ بتائی اور آپ نے اس کی تعمیر پانچ پہاڑوں کے پتھروں سے کی، جبل حراء، جبل ثبیر، جبل لبنان، جبل طور اور جبل الخمر۔

عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو جنت سے اتارا تو آپ کے دونوں پاؤں زمین پر تھے اور سر آسمان پر، آپ فرشتوں کا کلام اور ان کی دعائیں سن سکتے تھے، اس سے آپ کو انسیت تھی۔ لیکن فرشتوں کو ہیبت ہوئی اور انھوں نے اپنی دعاء اور نماز میں اللہ تعالیٰ سے اس کی شکایت کی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو زمین پر اس طرح اتار دیا کہ آپ

Marfat.com

فرشتوں کا کلام نہیں سن سکتے تھے۔ آپ اس اجنبی ماحول میں گھبرائے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی نماز اور دعا میں شکوہ کیا۔ اس کے بعد آپ نے مکہ کا رخ کیا۔ ایک ایک قدم میں آپ ایک ایک بستی اور میدان کا فاصلہ طے کر لیتے تھے۔ جب آپ یہاں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے جنت کے یاقوتوں میں سے ایک یاقوت نازل کیا۔ وہ یاقوت وہاں پر رہا جہاں اب خانہ کعبہ ہے۔ آپ اسی کا طواف کرتے رہے۔ پھر جب طوفانِ نوح آیا تو یہ یاقوت وہاں سے اٹھا لیا گیا اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنے زمانہ میں وہاں پہنچ کر خانہ کعبہ کی تعمیر اسی جگہ پر کی۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ آسمان سے آپ کو سب سے پہلے سرزمین ہند میں اتارا گیا تھا۔ آپ کا قد زمین سے آسمان تک تھا، لیکن فرشتوں کی دعا کے نتیجہ میں ساٹھ ہاتھ کی اس میں کمی کر دی گئی۔ جب آپ کو بتایا گیا کہ آپ کے لیے ایک گھر آسمان سے اتارا گیا ہے (خانہ کعبہ) تو فوراً آپ نے اس کا رخ کیا۔ ایک ایک قدم میں آپ پورے میدان کی مسافت طے کر لیتے تھے۔ آخر آپ بیت اللہ کے پاس پہنچ گئے اور اس کا طواف کیا۔ آپ کے بعد انبیاءؑ اس کا طواف کرتے تھے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ جہاں اب خانہ کعبہ ہے وہاں گنبد کی طرح ایک سرخ ٹیلہ تھا، جب اللہ تعالیٰ نے زمین پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو پانی سرخ یا سفید جھاگ کی صورت میں اس کے اوپر آ گیا۔ یہ اس مقام پر ہوا تھا جہاں اب خانہ کعبہ ہے۔ پھر اس کے نیچے سے زمین پھیلا دی گئی۔ جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو وہاں آباد کیا تو آپ نے وہیں خانہ کعبہ کی بنیاد رکھی۔ یہ قول مجاہد، عمرو بن دینار، عطاء بن ابی رباح رحمہم اللہ اور ابن عباس اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ بیت اللہ دنیا کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے پانی کے چار ستونوں پر کھڑا کیا گیا تھا، پھر زمین کو اس کے نیچے سے پھیلایا گیا۔ عطاء بن ابی رباح کی روایت میں ہے کہ لوگوں کو مکہ میں ایک پتھر ملا تھا جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی "بیشک میں" بکہ" والا ہوں میں نے اسے اس دن بنایا تھا جب سورج اور چاند کی تخلیق کی تھی اور سات افلاک سے میں نے اس کا احاطہ کیا"

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اہل علم سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو خانہ کعبہ کے پاس آباد ہونے کا حکم دیا تو آپ اپنے فرزند اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو ساتھ لے کر شام سے اس کی طرف روانہ ہوئے۔ اسماعیل علیہ السلام اس وقت شیر خوار بچے تھے۔ جیسا کہ مجھ سے بیان کیا۔ ان حضرات کو براق پر سوار کیا گیا۔ ساتھ ساتھ جبریل علیہ السلام کعبہ کی جگہ اور حرم کے نشانات بتانے کے لیے تھے۔ اس طرح یہ قافلہ شام سے روانہ ہوا۔ قافلہ جب بھی کسی بستی کے قریب پہنچتا تو ابراہیم علیہ السلام پوچھتے، جبریلؑ! کیا اسی بستی میں قیام کا مجھے حکم ہوا ہے۔ جبریل علیہ السلام کہتے کہ آگے چلئے۔ آخر قافلہ مکہ پہنچا۔ مکہ میں اس وقت صرف سلم اور ببول کے کانٹے دار درخت تھے۔ کچھ لوگ مکہ سے باہر اس کے چاروں طرف آباد تھے، انھیں عمالقہ کہا جاتا تھا۔ خانہ کعبہ کی جگہ اس وقت سرخ ٹیلہ کی صورت میں تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا، کیا ان دونوں کو یہیں آباد کرنے کا مجھے حکم ہے؟۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ چنانچہ آپ نے دونوں حضرات (اسماعیل اور ہاجرہ علیہما السلام) کو ایک پتھر کے نیچے لے جا کر اتارا اور اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اسی پتھر سے جھونپڑی کا کام لیں۔ اس کے بعد آپ نے دعا کی "رب انی اسکنت من ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زرع الی لعلھم یشکرون"۔

ابن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے، اور صحیح علم اللہ کے پاس ہے، کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں حضرات کو یہاں چھوڑا تو ایک فرشتہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا اور انھوں نے آپ کو خانہ کعبہ کی جگہ اشارہ سے بتائی، اس وقت وہ جگہ مٹی کا ایک سرخ ٹیلہ تھی۔ فرشتے نے ان دونوں حضرات سے کہا کہ زمین پر اللہ کا سب سے پہلا گھر یہی ہوگا اور یہی "بیت اللہ العتیق" ہے، ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اس کی بنیادوں کو بلند کریں گے۔

Marfat.com

ان تمام اقوال کی روشنی میں صحیح تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل ابراہیم اور ان کے فرزند اسماعیل علیہما السلام کو اس کے متعلق اطلاع دی ہے کہ انھوں نے خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کیں، ممکن ہے یہ اسی مکان کی بنیادیں تھیں جسے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے آدم علیہ السلام کے ساتھ نازل کیا تھا، ممکن ہے کہ یہ جگہ پہلے سے ایک ٹیلہ رہی ہو جسے اللہ تعالیٰ نے پانی کے جھاگ سے بنایا ہو، جیسا کہ عطاء کا خیال ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں کوئی یاقوت یا موتی رہا ہو جسے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں اللہ کا گھر پہلے آدم علیہ السلام نے بنایا ہو اور پھر وہ منہدم ہو گیا ہو اور دوسری تعمیر اسی جگہ ابراہیم علیہ السلام نے کی ہو۔ اسکا ہمیں کوئی علم نہیں کہ ان تمام اقوال میں سے کونسا قول صحیح ہے۔ اس لیے کہ نہ تو اس کی تعیین کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی روایت ہے اور نہ تاریخی حیثیت سے ان میں سے کسی ایک قول کی صحت کی ضمانت دی جا سکتی ہے، اس لیے جو تفسیر ہم نے آخر میں کی ہے وہی زیادہ مناسب ہو سکتی ہے[۱]۔

"رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا" (اے ہمارے پروردگار ہم سے یہ قبول کر) یعنی یہ دعا ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام خانہ کعبہ کی بنیادوں کو بلند کرتے وقت کرتے جاتے تھے۔ یہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت کے مطابق ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی تفسیر روایت ہوئی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تو خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کرتے جا رہے تھے اور اسماعیل علیہ السلام یہ دعا پڑھتے جاتے تھے۔ اس پر تو بہر حال سب کا اتفاق ہے کہ کعبہ کی بنیاد ابراہیم علیہ السلام نے بلند کی تھی، لیکن کیا اسماعیل علیہ السلام بھی اس میں آپ کے شریک تھے یا نہیں؟ اس میں اقوال مختلف ہیں۔

سدی اور عبید بن عمیر لیثی رحمہما اللہ سے روایت ہے کہ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام دونوں حضرات نے بنیاد کو بلند کیا۔ سدی کی روایت میں ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام مکہ پہنچے تو آپ اور اسماعیل علیہما السلام دونوں حضرات کدال ہاتھ میں لے کر اللہ کے حکم کی تعمیل کے لیے کھڑے ہو گئے، لیکن انھیں خانہ کعبہ کی جگہ معلوم نہیں تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی، اسے "رِيحُ الْخَجُوج" (تیز ہوا) کہا جاتا تھا۔ اس کے

---

[۱] اس سلسلہ کی روایتیں صحت کے اعتبار سے جو بھی درجہ رکھتی ہوں، بہر حال خانہ کعبہ کی قدامت ان سب سے قدر مشترک کے طور پر ثابت ہوتی ہے۔ اسلامی روایات کی روشنی میں اللہ کے اس گھر کی قدامت ناقابل انکار حقیقت ہے۔ مسیحیوں کو خانہ کعبہ اور اس کی قدامت سے ایک ضد ہے، لیکن حقیقت ان میں بھی بعض کی زبان پر آگئی ہے۔ مترجم قرآن جارج سیل نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ:۔

"مکہ جسے بکہ بھی کہا گیا ہے اور یہ دونوں الفاظ مترادف ہیں اور ان کے معنی مقام اجتماع عظیم کے ہیں۔ یقیناً دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ اور بعض کی رائے میں توریت کے شہر میسا سے یہی مراد ہے"

آگے لکھتا ہے "مکہ کا معبد اہل عرب کے درمیان مقدس اور ایک عبادتگاہ کی حیثیت سے بہت ہی قدیم زمانہ سے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی صدیوں قبل سے چلا آتا تھا"

باسورتھ اسمتھ نے "لکچرز آن محمد اینڈ محمڈن ازم" میں لکھا ہے کہ "بنائے کعبہ کا سلسلہ حسب روایات ابراہیم اور اسماعیل تک پہنچتا ہے، بلکہ شیث اور آدم تک، اور اس کا نام بیت ایل خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ اسے ابتدائی شکل میں کسی ایسے ہی بزرگ قبیلہ نے تعمیر کیا ہے" (ص ۱۶۶)

سب سے بڑھ کر قابل ذکر شہادت سر ولیم میور کے قلم سے "لائف آف محمد" میں ہے "مکہ کے مذہب کی تاریخ بہت ہی قدیم ماننی رہاتی بر صفحۂ آئندہ

دوپر، ایک سر اور سانپ کی صورت تھی۔ وہ ان کے سامنے کعبہ کے چاروں طرف اوپر سے گذری اور اللہ کے سب سے پہلے گھر کی بنیاد کی اس نے نشان دہی کردی۔ ان دونوں حضرات نے اسی کے مطابق کدال سے بیت اللہ کی نیو کھودی اور اسی پر بنیاد رکھی اسی کے متعلق قرآن میں ایک موقعہ پر ارشاد ہے "اور وہ وقت یاد دلایئے جب ہم نے ابراہیم کو بیت اللہ کی جگہ بتادی۔" جب خانہ کعبہ کی تعمیر اس جگہ تک پہنچ گئی جہاں رکن ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے اسمائیل علیہ السلام سے فرمایا، بیٹے! کوئی اچھا سا پتھر تلاش کر لاؤ، کہ میں اسے یہاں رکھ دوں۔ بیٹے نے عرض کی، ابا تھک کے چور ہو گیا ہوں۔ فرمایا، تلاش کر کے لاؤ۔ چنانچہ اسماعیل علیہ السلام گئے اور ایک پتھر تلاش کر کے لائے لیکن ابراہیم علیہ السلام کو وہ اچھا نہیں لگا۔ آپ نے فرمایا، دوسرا اس سے کوئی اچھا تلاش کر لاؤ۔ پھر آپ تلاش کرنے گئے تھے کہ لےتنے میں جبریل علیہ السلام ایک سیاہ پتھر ہند سے لائے۔ یہ پتھر پہلے سفید یاقوت تھا، جیسے ثغامہ (ایک سفید پھولوں والا درخت) ہوتا ہے۔ اس پتھر کو آدم علیہ السلام جنت سے لے کر اترے تھے، لیکن وہ لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے سیاہ ہو گیا تھا۔ اسماعیل علیہ السلام بھی دوسرا پتھر لے کر حاضر ہو گئے، لیکن جب آپ نے اس پتھر (حجر اسود) کو رکن کے پاس دیکھا تو پوچھا کہ یہ آپ کو کون دے گیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ جو تم سے زیادہ چست ہیں۔ اس کے بعد دونوں حضرات نے تعمیر مکمل کی۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کعبہ کی بنیاد ابراہیم علیہ السلام بلند کر رہے تھے اور اسماعیل علیہ السلام صرف آپ کو پتھر لا کر دیتے تھے۔ آپ نے بیان کیا کہ ابراہیم علیہ السلام مکہ تشریف لائے، اس وقت اسماعیل علیہ السلام زمزم کے قریب تیر بنا رہے تھے۔ جب آپ نے ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا تو تعظیم کے لیئے کھڑے ہو گئے اور باپ بیٹے جس طرح ملاقات کرتے ہیں اس طرح ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ بیٹے! اللہ نے مجھے ایک حکم دیا ہے۔ بیٹے نے عرض کی، پھر اللہ کے حکم کے مطابق کیجئے۔ فرمایا، کیا تم بھی میری مدد کرو گے؟ عرض کی، میں ہر مدد کے لیئے تیار ہوں۔ اب آپ نے اس جگہ کی طرف اشارہ کر کے کہا جہاں اب خانہ کعبہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہاں ایک گھر بنانے کا حکم دیا ہے۔ اس وقت وہ جگہ چاروں طرف سے ابھری ہوئی تھی۔ بیان کیا کہ اسی وقت دونوں حضرات اس کی تعمیر میں لگ گئے، اسمٰعیل علیہ السلام پتھر لاتے تھے اور ابراہیم علیہ السلام دیوار بناتے جاتے تھے۔ جب دیوار کچھ بلند ہو گئی اور نیچے سے پتھر لینے میں دشواری ہوئی تو اسماعیل علیہ السلام یہ پتھر لائے اور وہاں رکھ دیا۔ اب ابراہیم علیہ السلام اس پر کھڑے ہو کر تعمیر کرنے لگے یہی مقام ابراہیم ہے۔ اسماعیل علیہ السلام پتھر دیتے جاتے تھے اور دونوں حضرات کی زبان پر یہ دعا جاری تھی "اے ہمارے پروردگار ہم سے یہ قبول کر، بلاشبہ تو ہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔"

تیسرا قول یہ ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر ابراہیم علیہ السلام نے تنہا کی، اس وقت اسماعیل علیہ السلام بہت چھوٹے تھے۔ یہ قول علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ آپ کی روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیت اللہ کی تعمیر کا حکم دیا تو آپ حضرت ہاجرہ اور اسماعیل علیہما السلام کو لے کر نکلے۔ جب آپ مکہ پہنچے تو خانہ کعبہ کی جگہ اپنے اوپر بدلی جیسی کوئی چیز دیکھی، اس میں سر کی طرح کی کوئی چیز نظر آرہی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس سے گفتگو کی، اس میں سے آواز آئی، اے ابراہیم! میرے سائے کے مطابق بنانا اور اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرنا۔ چنانچہ آپ نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی اور ہاجرہ اور اسماعیل علیہما السلام کو وہیں چھوڑ کر چلنے لگے۔ ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) پڑتی ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ ایک نامعلوم زمانہ سے ملک عرب کا مرکز چلا آتا ہے جس مقام کا تقدس اتنے وسیع رقبہ میں مسلم ہو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کی بنیاد قدیم ترین زمانہ سے چلی آتی ہے۔" (تفسیر ماجدی)

Marfat.com

ابراہیم! ہمیں کس کے بھروسے چھوڑے جا رہے ہو؟ فرمایا کہ اللہ کے بھروسے پر۔ اس پر ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ پھر آپ جائیے، اللہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔

بیان کیا کہ اس کے بعد اسماعیل علیہ السلام کو بڑی شدید پیاس لگی۔ پانی کی تلاش میں ہاجرہ رضی اللہ عنہا قریب کی صفا پہاڑی پر چڑھیں اور چاروں طرف دیکھا، لیکن کہیں کچھ نظر نہ آیا۔ پھر اتر کر مقابل کی دوسری پہاڑی مروہ پر گئیں۔ وہاں سے بھی چاروں طرف نظر دوڑائی، لیکن کہیں کچھ نظر نہ آیا۔ پھر پریشانی کے عالم میں دوبارہ صفا پر آکر چاروں طرف دیکھا۔ اس طرح آپ نے سات مرتبہ دونوں پہاڑیوں کا چکر لگایا۔ آخر بولیں، اسماعیل، تمھیں مرتا ہوا میں نہ دیکھوں۔ اس مرتبہ قریب آئیں تو آپ پیاس کی شدت میں اپنی ایڑیاں زمین پر رگڑ رہے تھے اتنے میں جبریل علیہ السلام نے آواز دی اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ آپ بولیں کہ ہاجرہ، ابراہیم کے لڑکے کی والدہ۔ پوچھا، انھوں نے آپ دونوں حضرات کو کس کے بھروسے پر چھوڑا تھا؟ جواب دیا کہ اللہ کے بھروسے پر۔ جبریل علیہ السلام نے کہا کہ پھر جس کے بھروسے پر انھوں نے آپ کو چھوڑا ہے وہ کافی ہے۔ پھر انھوں نے اپنی انگلی سے زمین کھودی اور زمزم کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ ہاجرہ رضی اللہ عنہا پانی روکنے لگیں تو جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ اسے یوں ہی رہنے دو، یہ دوا بھی ہے۔

یہ تین اقوال ہیں، اور آیت کی تفسیر تینوں اقوال کے مطابق کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک بہتر تفسیر یہ ہے کہ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام دونوں حضرات نے خانہ کعبہ کی بنیاد کو بلند کیا۔ اگر ابراہیم علیہ السلام ہی تنہا دیوار بنا رہے تھے اور بنیاد کو بلند کر رہے تھے اور اسماعیل علیہ السلام صرف پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے، جب بھی بنیاد کو بلند کرنے کی نسبت دونوں حضرات کی طرف کی جا سکتی ہے۔ اہلِ عرب کے یہاں عام دستور کے مطابق بنانے والے اور تعمیر میں مدد دینے والے دونوں کی طرف تعمیر کی نسبت کرتے تھے، اس لیے اگر یہ مان لیا جائے کہ عمارت بنا رہے تھے تنہا ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام صرف پتھر لا کر دیتے تھے، تب بھی بنیاد کو بلند کرنے کی نسبت دونوں حضرات کی طرف کی جا سکتی ہے۔ یہ تفسیر ہم نے اس لیے کی کہ تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ آیت کی دعا "رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" "اے ہمارے رب ہم سے یہ قبول کر، بے شک آپ سب کچھ سننے والے، سب کچھ جاننے والے ہیں" ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام دونوں حضرات نے کی تھی۔ ظاہر ہے کہ اسماعیل علیہ السلام یہ دعا اسی وقت کر سکتے تھے جب وہ پورے مرد رہے ہوں گے یا کم از کم آپ کی اتنی عمر رہی ہوگی جب انسان نفع نقصان پہچانتا ہے اور اللہ کے فرائض و احکام اور دوسری ذمہ داریوں کی ادائیگی اس پر واجب ہوتی ہے۔ اس لیے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس عمر میں ہونے کے باوجود آپ نے اپنے والد کی مدد نہیں کی ہوگی اور خانۂ کعبہ کی تعمیر میں حصہ نہیں لیا ہوگا، خواہ یہ مدد دیوار بنانے میں رہی ہو یا صرف پتھر اٹھانے میں، ان میں سے جو بھی صورت رہی ہو، بہرحال اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ بھی خانہ کعبہ کی بنیاد بلند کرنے والوں میں تھے۔ چنانچہ آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ "اور جب ابراہیمؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے، اور اسماعیلؑ، تو دونوں حضرات کہتے جاتے تھے کہ اے ہمارے رب! ہم سے یہ قبول کر، بے شک آپ سننے والے جاننے والے ہیں۔"

اس سے یہ بھی صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ حضرات نے یہ گھر رہنے سہنے کے لیے نہیں بنایا تھا، بلکہ اس کی تعمیر کا مقصد عبادتِ الٰہی تھا، کہ جو شخص بھی اللہ کی عبادت اخلاصِ نیت کے ساتھ کرنا چاہے وہ یہاں آکر کرے۔ اگر اپنے ذاتی استعمال کے لیے انھوں نے یہ گھر بنایا ہوتا تو مذکورہ بالا دعا کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ "إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" یعنی بلاشبہ ہم اپنی اس طاعت کی قبولیت کی جو دعا آپ سے کر رہے ہیں اسے آپ بہت سننے والے ہیں اور آپ کی رضا و محبت کے حصول کے لیے ہمارے جذبات اور ہمارے عمل میں اخلاصِ نیت کا آپ کو خوب علم ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "السمیع" یعنی دعا کے

Marfat.com

سننے والے ہیں۔
"رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ" یہ بھی ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے متعلق اطلاع
ہے کہ خانہ کعبہ کی بنیادوں کو بلند کرتے وقت دونوں حضرات ایک دعاء یہ بھی کر رہے تھے کہ "اے ہمارے پروردگار، ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار
بنا دے اور ہماری نسل سے ایک اپنی فرماں بردار امت پیدا کر"۔ "وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ" یعنی ہمیں اپنا فرماں بردار، اطاعت گذار اور
اپنی طاعت کے لیے جھک جانے والا بنا، کہ ہم تیرے سوا کسی کو تیری عبادت میں شریک نہ کریں، صرف تیری ہی عبادت و طاعت کریں "اسلام"
(جس سے "مسلمین" نکلا ہے) کا مفہوم ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ "وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ" (اور ہماری نسل سے اپنی ایک
فرماں بردار امت پیدا کر) میں اپنی تمام نسل کے لیے یہ دعاء نہیں کی، بلکہ ایک مخصوص طبقہ کو خاص رکھا، کیونکہ اس دعاء سے پہلے اللہ تعالیٰ نے
آپ کو بتایا تھا کہ جو لوگ نافرمان اور حد سے تجاوز کرنے والے ہیں انھیں اللہ کا وعدہ نہیں پہنچے گا۔

سدی سے ایک روایت میں ہے کہ اس سے مراد آپ حضرات نے اہل عرب لیا تھا۔ لیکن آیت کے الفاظ اور اس کی ترتیب سے
اس مفہوم کی نفی ہوتی ہے، آیت میں تو صرف اتنا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی نسل سے ایک فرماں بردار امت پیدا کرنے کی دعاء
کی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں عرب (بنی اسماعیل) بھی ہیں اور غیر عرب (بنی اسرائیل وغیرہم) بھی ہیں، یہ دعاء ظاہر ہے کہ آپ کی نسل کے
تمام سلسلوں کے لیے ہے اور سب ہی میں دعاء میں مذکور اوصاف کے حامل افراد پیدا ہوئے۔ "أُمَّةً" سے آیت میں مراد جماعت
ہے۔ ایک دوسرے موقعہ پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے "وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ" (اور موسیٰؑ کی قوم میں
ایک جماعت ایسی بھی ہے جو (دوسروں کو) حق کے مطابق ہدایت کرتی ہے)۔

"وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا" (اور ہم کو ہمارے قاعدے بتلا دے)۔ اہل حجاز اور کوفہ کے علماء قرارت عام طور سے "أَرِنَا" پڑھتے
ہیں، "إِرَاءَة" سے یعنی ہماری آنکھوں کے سامنے ظاہر کر دیجئے تاکہ ہم اسے دیکھ لیں۔ اس قرارت کی بنیاد پر "مَنَاسِكَنَا"
کے مفہوم کی تعیین میں مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ مراد حج کے مناسک و مشاہد ہیں۔ چنانچہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے
اس تفسیر کے مطابق روایت ہے کہ اس دعاء کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں حضرات کو ان کے مناسک حج یعنی بیت اللہ کا طواف،
صفا اور مروہ کے درمیان سعی، عرفات سے روانگی، منیٰ سے روانگی اور رمی جمار سب کچھ دکھایا اور اللہ نے اپنے دین کو مکمل کر دیا۔ ایک
روایت میں آپ سے بصراحت ہے کہ مراد تمام مناسک و مشاہد حج ہیں۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام خانہ کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے
انھیں حکم دیا کہ ندا دیں، لوگوں کو حج کے لیے پکاریں۔ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے پتھریلے میدانوں کے درمیان ندا دی کہ لے لوگو!
اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم اس کے گھر کا حج کرو۔ بیان کیا کہ یہ ندا ہر مومن کے دل میں جاگزیں ہو گئی، اور پہاڑ، درخت اور چوپایوں سے جس نے
بھی سنا "لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ" (ہم حاضر ہیں، ہم حاضر ہیں) سے جواب دیا۔ اور جسے وہاں پہنچنا تھا پہنچا۔ پھر اللہ نے آپ کو عرفات
جانے کا حکم دیا، اللہ نے اس مقام کے اوصاف آپ سے بیان کر دیئے۔ آپ روانہ ہوئے لیکن جب مقام عقبہ کے قریب درخت
کے پاس پہنچے تو شیطان آپ کے سامنے آگیا۔ آپ نے اسے سات کنکریوں سے مارا، ہر کنکری مارتے وقت آپ تکبیر کہتے جاتے
تھے۔ شیطان وہاں سے اڑ کے بھاگا۔ پھر جمرۂ ثانیہ (دوسرے جمرہ) کے مقام پر بھی وہ آپ کے سامنے آگیا اور راستہ روک لیا۔ آپ
نے وہاں بھی تکبیر کہتے ہوئے اسے کنکریوں سے مارا۔ وہ اڑ کے بھاگا۔ اس کے بعد وہ تیسرے جمرہ کے پاس پہنچا۔ وہاں بھی آپ نے اسے
تکبیر کہتے ہوئے کنکریوں سے مارا۔ آخر شیطان کو بھی اپنی بے بسی کا احساس ہو گیا۔ ادھر ابراہیم علیہ السلام کو بھی سمجھ میں نہیں آرہا

تھا کہ کدھر جائیں۔ بہرحال آپ چلتے رہے۔ جب آپ ذوالمجاز پر پہنچے تو آپ نے اس مقام کو دیکھا، لیکن پہچان نہ سکے اور آگے بڑھ گئے، اسی لیئے اس مقام کا نام ذوالمجاز پڑا۔ آپ آگے بڑھتے رہے اور عرفات میں پہنچ گئے۔ جو اوصاف اللہ تعالیٰ نے اس کے بیان کیئے تھے اس کے مطابق آپ نے اسے پہچان لیا اور فرمایا کہ میں پہچان گیا۔ اسی لیئے اس جگہ کا نام "عرفات" پڑا۔ ابراہیم علیہ السلام یہیں عرفات میں ٹھہر گئے۔ جب شام ہوئی تو آپ مزدلفہ کے قریب پہنچے، اس لیئے اس مقام کا نام "مزدلفہ" پڑا۔ (رات) آپ نے مزدلفہ میں گذاری۔ وہاں سے آپ روانہ ہوئے تو جہاں پہلی مرتبہ شیطان آپ سے ملا تھا وہیں پھر سامنے آیا۔ آپ نے سات کنکریوں سے اسے سات مرتبہ مارا۔ پھر آپ نے منیٰ میں قیام کیا، اور آخرالامر آپ اعمالِ حج سے فارغ ہوگئے۔ آیت "وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا" میں اسی کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

اسی قرارت کی بنیاد پر دوسرا قول یہ ہے کہ "مناسک" سے مراد قربانی ہے۔ آیت کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ "اے ہمارے رب! ہمیں دکھا دیجیے کہ ہم کس طرح آپ کے لیئے اپنی قربانیوں کو پیش کریں اور انھیں آپ کے لیئے ذبح کریں۔ اس قول کی روایت عطاء، مجاہد اور عبید بن عمیر سے ہے۔

دوسری قرارت "اَرْنَا" کے "را" کے جزم کے ساتھ "وَاَرْنَا مَنَاسِكَنَا" ہے۔ اس صورت میں معنی "عَلِّمْنَا وَدُلَّنَا عَلَيْهَا" "ہمیں ہمارے مناسک سکھلا دے، بتلا دے" کے ہوں گے "آنکھوں سے دکھلا دینے" کا معنی یہاں مراد نہیں ہوگا۔ اشعارِ عرب میں اس کی مثال ملتی ہے۔ اس قرارت کی روایت بعض متقدمین علماء سے ہے۔ یہ قول عطاء سے منقول ہے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اسی کی موافقت میں روایت ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو عرض کی کہ اے رب! میں نے کام انجام دے دیا، اب آپ ہمیں اس کے مناسک بتا دیجیے چناں چہ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو بھیجا اور انھوں نے حج کر کے بتا دیا۔ دونوں قول مفہوم و مقصد کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔

"مَنَاسِك" "مَنْسَك" کی جمع ہے، اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیئے ایسے نیک اعمال کیئے جائیں جن سے وہ راضی ہو، نیک عمل قربانی ذبح کرنے کی صورت میں ہو یا نماز، طواف اور سعی وغیرہ کی صورت میں ہو، اسی لیئے اعمالِ حج کے ادا کرنے کی جگہوں کو بھی "مناسک" کہتے ہیں، کہ وہ بھی علامتیں اور نشانیاں ہیں جہاں لوگ بار بار آتے رہتے ہیں۔ کلامِ عرب میں "نُسُک" کے اصل معنی اس جگہ کے ہیں جہاں ہمیشہ کوئی شخص آتا جاتا رہے اور اس سے مانوس ہو، بولتے ہیں "لِفُلَانٍ مَنْسَكٌ" یعنی فلاں کی ایک منتخب جگہ ہے، جہاں کسی اچھے یا بُرے مقصد کے لیئے عادۃً آتا جاتا رہتا ہے۔ اعمالِ حج کے ادا کرنے کے مقامات کو "مناسک" بھی اسی لیئے کہتے ہیں کہ وہاں ہمیشہ سے لوگ حج، عمرہ اور دوسرے ان اعمال کے لیئے جن سے اللہ کا قرب حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے، آتے رہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ "نُسُک" کے معنی اللہ کی عبادت کے ہیں اور ناسک کو "ناسک" اس لیئے کہتے ہیں کہ وہ اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ اس کی بنیاد پر آیت "اَرِنَا مَنَاسِكَنَا" کا مطلب یہ ہوگا کہ "ہمیں اپنی عبادت کے متعلق سکھا دے کہ ہم تیری کس طرح عبادت کریں اور کہاں کریں اور ہمیں وہ چیزیں بتا دے جن سے تیری خوشنودی حاصل ہوتی ہے، تاکہ ہم ان پر عمل کریں" گنجائش اس قول کے لیئے بھی نکل سکتی ہے، لیکن عام و معروف معنی وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا۔ یہ کلام ابراہیم اور اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے اپنے رب سے اپنے لیئے اور اپنی نسل کے لیئے ایک سوال ہے۔

اس سے پہلے اس سلسلہ کی ابتدائی آیت میں دونوں حضرات کی خاص اپنی نسل کے مسلم طبقہ کے لیئے دعاء "وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ" کے الفاظ کے ساتھ نقل ہوئی اور اس آیت کے بعد "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ" میں بھی خاص اپنی نسل کے لیئے دعاء ہے۔ اور اس آیت میں اپنے اور اپنی مسلم نسل دونوں کے لیئے ایک ساتھ دعاء کی ہے۔

Marfat.com

"وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ" (اور ہماری توبہ قبول کر، یقیناً تو بڑا توبہ قبول کرنے والا، بڑا مہربان ہے) "تَوْبَۃ" (جس سے تُبْ اور توّاب نکلا ہے) کا اصل مفہوم "کسی ناپسندیدہ چیز سے پسندیدہ چیز کی طرف لوٹنا" ہے۔ اس لیے بندہ کی اپنے رب سے "توبہ" کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو امور اللہ کو ناپسند ہیں، اگر وہ اس سے سرزد ہوگئے ہیں، تو ندامت کے ساتھ ان سے پھر جائے اور ہمیشہ کے لیے ان کی جڑ اکھاڑ دے اور عزم کرلے کہ پھر کبھی ان کا اعادہ نہ ہوگا۔ اور اللہ کی توبہ اپنے بندوں کے حق میں یہ ہے کہ "اللہ اپنے بندہ کو اسکی ناپسندیدہ حرکت پر سزا نہ دے، بلکہ اس کے بجائے اس کا جرم معاف کردے اور اس کی مغفرت کرے"، گویا سزا سے عفو و درگذر کی طرف لوٹ جانا اللہ کی اپنے بندے کے حق میں توبہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ابراہیم و اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام سے بھی کوئی گناہ سرزد ہوا تھا کہ اس سے توبہ کی ضرورت پیش آئی؟

جواب یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق میں کوئی فرد ایسا نہیں جو اپنے اعمال کے بارے میں بے نیاز ہو، ہر شخص سے اس کی شان کے مطابق ادائگی اعمال میں کوئی نہ کوئی لغزش ہوسکتی ہے اور فیما بینہ و بین اللہ اس کے کچھ اعمال ایسے ہوتے ہیں کہ اپنے رب سے اسے اس کے بارے میں توبہ کرنی ضروری ہے، ممکن ہے کہ ان دونوں حضرات انبیاء نے بھی توبہ اسی وجہ سے کی ہو۔ توبہ بیت اللہ کی تعمیر کے وقت اسی مقام پر اس لیے کی کہ وہاں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرتا ہے اور یہ وجہ بھی تھی کہ اس مقام پر آپ حضرات کا یہ عمل بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے سنت بن جائے اور لوگ اس مبارک مقام کو اپنے گناہوں سے اللہ کے حضور میں توبہ کرنے کی خاص جگہ بنالیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ "وَتُبْ عَلَيْنَا" سے مراد آپ حضرات نے اپنی نسل کے گناہ گار اور ظالم افراد کو لیا ہو یعنی ہماری نسل اور اولاد میں جن لوگوں نے ظلم اور حد سے تجاوز کیا ان کی توبہ قبول کر اور ان کے حال پر توجہ کر تاکہ وہ تیری طاعت کی طرف لوٹ آئیں۔ اس صورت میں بظاہر تو آپ حضرات کی دعاء اپنے لیے ہے لیکن حقیقتاً مراد نسل ہے۔ "اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ" کا مطلب یہ ہے کہ بلاشبہ آپ اپنے بندوں پر فضل و کرم اور عفو و غفران کے ساتھ توجہ کرنے والے ہیں اور ان پر بڑے مہربان ہیں کہ جسے چاہیں اپنی رحمت سے ہلاکت سے بچالیں۔

"رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ" (اے ہمارے پروردگار ان میں ایک پیغمبر ان ہی میں سے بھیج جو انھیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائیں)۔ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی یہ دعاء خاص ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے یہی وہ دعاء ہے جس کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ "میں اپنے جدّ امجد ابراہیم علیہ السلام کی دعاء ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت"۔ یہ روایت عرباض بن ساریہ سلمی رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ رضہ سے منقول ہے آیت کی جو تفسیر ہم نے کی وہی مفسرین کی ایک جماعت سے منقول ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس دعاء کے مطابق ہی کیا اور ان عربوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان لوگوں میں اپنی ذات اور اپنے نسب کے اعتبار سے جانے پہچانے تھے، انھیں تاریکیوں سے نور اور روشنی کی طرف نکال کر لائے تھے اور اللہ تعالیٰ کے سیدھے راستے کی ہدایت کرتے تھے۔ یہی تفسیر سدی اور ربیع سے بھی منقول ہے۔

"يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ" یعنی انھیں تیری وہ کتاب پڑھ کر سنائیں جو تو ان کی طرف وحی کرے۔ "وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَۃَ" (اور انھیں کتاب اور دانائی کی تعلیم دیں) "الکتاب" سے مراد قرآن مجید ہے۔ اس سے پہلے ہم بیان کرچکے ہیں کہ قرآن کو کتاب کہنے کی کیا وجہ ہے۔ "الکتاب" کی یہی تفسیر مفسرین کی ایک جماعت سے منقول ہے۔ ابن زیدؒ کی بھی یہی تفسیر ہے "الحکمۃ" کی تفسیر کے سلسلے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ اس سے مراد "سنت" ہے، قتادہؒ سے یہی قول نقل ہوا ہے۔ بعض دوسرے مفسرین نے کہا کہ حکمت سے مراد "دین کی معرفت اور تفقہ فی الدین" ہے۔ امام مالکؒ سے

Marfat.com

ابن وہبؒ نے پوچھا کہ "الحکمۃ" کیا چیز ہے؟ فرمایا کہ دین کی معرفت اور تفقہ فی الدین اور اس کی اتباع۔ ابن وہب سے نقل ہے کہ ابن زیدؒ نے فرمایا، حکمت سے مراد "دین" ہے، جس کی معرفت صرف آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے، آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اس کی تعلیم دیتے تھے۔ بیان کیا کہ حکمت سے مراد دین کی سمجھ ہے۔ اس کے بعد "مَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا (جسے حکمت دیدی گئی اسے بہت بڑی بھلائی دیدی گئی) کی تلاوت کی۔ آپ نے بیان کیا کہ ابن زیدرح نے یہ آیت تلاوت کی "وَاتْلُ عَلَیْہِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰہُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْہَا" (اور ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنا یئے جسکو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں پھر وہ انسے بالکل نکل گیا) بیان کیا کہ یہ لوگ اللہ کی آیات سے فائدہ نہیں اٹھا سکے کیونکہ حکمت سے بے بہرہ تھے۔ بیان کیا کہ "حکمت" ایک ایسی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ دل میں رکھ دیتا ہے اور دل کو اس کے نور سے منور کر دیتا ہے۔ ہمارے نزدیک صحیح قول یہ ہے کہ "حکمت" اللہ تعالیٰ کے احکام کا وہ علم ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے وضاحت اور بیان کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ میرے نزدیک یہ لفظ "حکم" سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ حق اور باطل کے درمیان فرق کے آتے ہیں۔ آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ اے ہمارے رب ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج جو انھیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انھیں اس کتاب کی تعلیم دے جو تو ان پر نازل کرے، اور تیرے احکام اور فیصلوں کو واضح طور پر بیان کرے۔

"وَیُزَکِّیْہِمْ" (اور انھیں پاک کرے) تزکیہ کا مفہوم ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ پاک کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "جو انھیں اللہ کے ساتھ شرک اور بتوں کی عبادت سے پاک کرے اور اللہ کی طاعت میں انھیں بڑھائے"۔ ابن عباسؓ اور ابن جریجؒ سے یہی منقول ہے۔

"اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ" یعنی اے رب بے شک تو بڑا غالب وقوی ہے کہ جس کے ارادے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوسکتی اس لیئے ہمارے اور ہماری نسل کے متعلق ہماری دعاؤں کو پورا فرمادے تو بڑا حکیم ہے کہ جس کی تدبیر میں کسی قسم کا خلل اور جھول نہیں ہوسکتا، پس ہمیں وہ چیزیں بخش دے جس سے ہمیں اور ہماری نسل کو نفع ہو۔

وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّۃِ اِبْرٰہٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِہَ نَفْسَہٗ ط وَلَقَدِ

اور ملت ابراہیمی سے تو وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو۔ اور ہم نے (اُسی کی بدولت تو) اُن

اصْطَفَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا ج وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ○

(ابراہیم عؑ) کو دنیا میں منتخب کیا۔ اور (اُسی کی بدولت) وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں

اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗٓ اَسْلِمْ لا قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

جب کہ اُن سے اُن کے پروردگار نے فرمایا کہ تم (خدا کی) اطاعت اختیار کرو انھوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی رب العٰلمین کی۔

وَوَصّٰی بِہَآ اِبْرٰہٖمُ بَنِیْہِ وَیَعْقُوْبُ ط یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی

اور اسی (ملت) کا حکم کر گئے ہیں ابراہیم (علیہ السلام) اپنے بیٹوں کو اور (اسی طرح) یعقوبؑ بھی۔ میرے بیٹو اللہ تعالیٰ نے اس دین (اسلام) کو تمہارے لیے

Marfat.com

لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ○

منتخب فرمایا ہے سو تم بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا۔

انبیاء علیہم السلام کی وصیت

"وَمَن يَرْغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ" یعنی کون ہے جو ابراہیمؑ کے طریقہ سے پھر کر دوسرے طریقوں کی طرف جائے گا۔ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں، کیونکہ انھوں نے اسلام پر، جو ابراہیم علیہ السلام کا مذہب تھا، یہودیت و نصرانیت کو ترجیح دی تھی، اور اسے اپنا دین بنالیا تھا۔ جیساکہ ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہے کہ "مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا ولکن کان حنیفا مسلما" (ابراہیمؑ نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی، بلکہ حنیف مسلم تھے)

زیر تفسیر آیت کا مطلب یہ ہے کہ سوائے اس کے جس نے اپنے آپ کو بے وقوف بنالیا ہو اور کون ہے جو ابراہیم علیہ السلام کی ملتِ حنیفہ سے پھر سکتا ہے۔ قتادہ اور ربیع رحمہما اللہ سے یہی تفسیر منقول ہے کہ یہود و نصاریٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی ملتِ حنیفہ کو چھوڑ کر اپنا نیا دین ایجاد کرلیا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر مبعوث کیا۔

"إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُ" یعنی سوائے اس کے جو احمق اور جاہل ہو۔ اب پوری آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ابراہیمؑ کی ملّتِ حنیفہ سے سوائے بے وقوف اور جاہل کے جو اپنی آخرت کے نفع و نقصان کو نہ پہچانتا ہو، اور کوئی شخص نہیں پھر سکتا۔ "نَفْسَهُ" کو نصب (زبر) ایسا ہی ہے جیسے "ھواؤسعکم دارًا" میں "دارًا" کو نصب ہے۔

"وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا" اور ہم نے ابراہیمؑ کو دنیا میں برگزیدہ بنایا تھا۔ "ہٗ" کی ضمیر سے مراد ابراہیم علیہ السلام ہیں "اصطفاء" صفوۃ سے نکلا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے انھیں اپنی دوستی کے لیے چُن لیا اور دنیا میں انھیں ان کے بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے امام اور پیشوا بنالیا۔ اطلاع دی جارہی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے طریقے کی جو شخص مخالفت کرے گا وہ اللہ کا مخالف ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی تنبیہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دین کا مخالف ابراہیم علیہ السلام کا مخالف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیت میں بتایا ہے کہ اس نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنی مخلوق میں سے منتخب کرلیا ہے، اور انھیں لوگوں کا پیشوا بنایا ہے اور یہ بھی اطلاع دی ہے کہ آپ کا دین حنیفیت اور اسلام ہے۔ اس سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مخالف اللہ کا مخالف اور دشمن ہے۔

"وانہ فی الاخرۃ لمن الصالحین" اور ابراہیمؑ آخرت میں بھی صالحین میں سے ہوں گے۔ "صالح" ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اللہ کے حقوق کو ادا کرنے والا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ آپ آخرت میں بھی اللہ کے ان ولیوں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے جنھوں نے اس کا عہد پورا کیا ہوگا

"إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ" یعنی جب ان سے ان کے رب نے کہا کہ عبادت میں میرے لیے مخلص ہوجاؤ اور میری طاعت کے لیے جھک جاؤ تو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں، تمام مخلوق کے مالک اور اس کی تدبیر کرنے والے کے لیے جھک گیا، اور عبادت اسی کے لیے خاص کردی، اس کے علاوہ کسی کے لیے بھی نہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے دنیا میں انھیں اس وقت چن لیا تھا جب ہم نے ان سے کہا کہ فرمانبردار ہوجاؤ تو وہ بولے کہ میں دونوں جہان کے پالنے والے کا فرماں بردار ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اسلام (فرماں برداری و طاعت) کی طرف اس وقت بلایا تھا جب آپ نے اپنی قوم کے سامنے یہ اعلان کیا تھا کہ "وہ بولے، اے لوگو میں اس شرک سے بری اور بیزار ہوں جو تم کیا کرتے ہو، یقیناً میں نے اپنا رخ یکسو ہو کر اس کی طرف کرلیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں" اس موقعہ پر ان کے رب نے

Marfat.com

ان سے فرمایا تھا کہ "فرماں بردار ہو جاؤ"۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ آپ کو ستاروں، چاند اور سورج سے آزما چکا تھا۔
"وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ" (اور ابراہیم اس کی ہدایت کر گئے اپنے بیٹوں کو اور اسی طرح یعقوب[1] بھی) یعنی اس کلمہ "اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" کی ہدایت کر گئے تھے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے انھیں دیا تھا کہ اللہ کی توحید اور اس کی عبادت میں اخلاص اور اس کے لیے دل اور تمام اعضاء کے ساتھ جھکنا اور خضوع اختیار کرنا۔ "وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ" کا مفہوم یہ ہے کہ آپ نے اپنے بیٹوں کو اس کا حکم دیا تھا اور اس کا عہد لیا تھا۔ "وَيَعْقُوْبُ" یعنی یعقوب نے بھی یہی ہدایت اپنے بیٹوں کو کی تھی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ "وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ" پر جملہ ختم ہو جاتا ہے، اور "وَيَعْقُوْبُ" سے ایک الگ جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ کہیں کہ ہم دونوں جہان کے پالنے والے کے فرماں بردار ہیں، اور یعقوب[1] نے اپنے بیٹوں کو ہدایت کی تھی کہ "اے بیٹو، اللہ نے تمہارے دین کا انتخاب کر لیا ہے، اس لیے ایسا ہرگز نہ ہو کہ تم مرتے وقت مسلم کے سوا کچھ اور رہو" لیکن اس تفسیر کا کوئی واضح مفہوم نہیں، کیونکہ یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے بیٹوں کو وہی ہدایت کی تھی جو اسماعیل علیہ السلام نے کی تھی، یعنی اللہ کی طاعت، اس کے لیے خضوع اور اسلام کی۔

"يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ" یعنی اے میرے بیٹو، بے شک اللہ نے تمہارے لیے اس دین کا انتخاب کر لیا ہے، جس کا اس نے تمھیں حکم دیا ہے اور جس کے لیے تمھیں منتخب کیا ہے۔

"الدِّيْنَ" پر الف لام معرفہ کا اس لیے لائے کہ ان کی اولادیں، جن لوگوں کو مخاطب کیا جا رہا ہے وہ اس ہدایت و حکم سے خوب واقف تھے۔ پھر ارشاد ہوا کہ جبکہ تمھیں خوب علم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اسی دین اسلام کا انتخاب کیا ہے تو اللہ سے اس بارے میں ڈرو کہ کہیں تمہاری موت اس حالت میں ہو جائے کہ تم مسلم نہ ہو۔ "فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ" (بس ایسا ہرگز نہ ہونے پائے کہ مرتے وقت تم مسلم کے سوا کچھ اور ہو)۔ مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف موت کے وقت اس دین اسلام کو اختیار کر لینا، بلکہ کہا یہ جا رہا ہے کہ بلا کسی تاخیر کے اس دین میں آجاؤ، اور پھر زندگی بھر اس سے الگ نہ ہو، کیونکہ کسی کو نہیں معلوم کہ اس کی موت کب آجائے گی۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ

کیا تم خود (اس وقت) موجود تھے جب یعقوب علیہ السلام کا آخری وقت آیا۔ (اور) جس وقت انھوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ

کہ تم لوگ میرے مرنے کے بعد کس چیز کی پرستش کرو گے انھوں نے بالاتفاق جواب دیا کہ ہم اس کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے بزرگ (حضرات)

اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

ابراہیم و اسمٰعیل و اسحاق کرتے آئے ہیں یعنی وہی معبود جو وحدہٗ لاشریک ہے اور ہم اُسی کی اطاعت پر قائم رہیں گے۔

۱؎ آپ حضرت اسحاق علیہ السلام کے صاحبزادے، اور ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ہیں۔ خود بھی نبی ہیں۔ اسرائیل آپ کا دوسرا نام ہے۔ عمر حسب روایت توریت ۱۴۷ سال ہے۔ ولادت کنعان (فلسطین) میں ہوئی۔ وفات مصر میں اپنے صاحبزادے یوسف علیہ السلام کے پاس ہوئی۔

Marfat.com

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ

یہ (اُن بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو گذر چکی۔ اُن کے کام ان کا کیا ہوا آوے گا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آویگا اور تم سے اُن کے کیئے ہوئے کی

عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

پوچھ بھی تو نہ ہوگی۔

غلط دعوے نفع نہیں پہنچائیں گے

"أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ"، (کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کو موت آپہنچی) "أَمْ"، حرف استفہام (سوالیہ) "أَ"، (کیا) کے معنیٰ میں ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی ایسے کلام کے متعلق جسکا ذکر پہلے ہو چکا ہو، سوال کسی جملہ مستانفہ کے ذریعہ کیا جائے تو کلمہ استفہام "ام"، لاتے ہیں۔ اہلِ عرب اسی طرح استعمال کرتے تھے۔ "شُهَدَاءَ" شَهِيْد کی جمع ہے (بمعنی موجود) جیسے "شُرَكَاءُ"، شَرِيْك کی اور خُصَمَاءُ خَصِيْم کی جمع استعمال ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے جماعت یہود و نصاریٰ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلاتے ہو اور آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہو، کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کو موت آئی تھی؟ کلام کا مقصد یہ ہے کہ تم اس وقت موجود نہیں تھے، اس لیئے تمھیں میرے انبیاء اور رسولوں کے متعلق غلط اور بے بنیاد باتوں کا دعویٰ نہ کرنا چاہیئے اور نہ تمھیں اپنا اپنا الگ دین یہودیت اور نصرانیت ایجاد کرنا چاہیئے تھا، کیونکہ میں نے اپنے خلیل ابراہیم اور ان کے صاحبزادے اسحٰق اور اسمٰعیل اور ان کی نسل کو دین حنیفیہ مسلمہ دے کر بھیجا تھا، اور اس دین کی ان حضرات نے اپنی اولاد کو بھی وصیت کی تھی، اگر تم واقعی ان کی موت کے وقت موجود ہوتے تو ان کی وصیت کو سنتے اور تمھیں معلوم ہوتا کہ یہ حضرات جو مذہب اور دین لے کر آئے تھے وہ اس سے بالکل مختلف تھا جو تم نے ایجاد کرلیا ہے۔ یہ آیتیں یہود و نصاریٰ کے اس دعوے کی تکذیب کے لیئے نازل ہوئی تھیں کہ ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے صاحبزادے اور یعقوب علیہ السلام بھی انھیں کے دین پر تھے۔ اس لیئے ان سے کہا جارہا ہے کہ کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب علیہ السلام نے موت کے وقت اپنے صاحبزادوں کو وصیت کی تھی، کہ تمھیں معلوم ہوتا کہ انھوں نے اپنے صاحبزادوں سے کیا کہا تھا اور صاحبزادوں نے اس کا کیا جواب دیا تھا؟۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے بھی روایت ہے کہ آیت سے مراد اہلِ کتاب ہیں۔ آگے کی آیت میں یعقوب علیہ السلام کی وصیت کا ذکر ہے۔

"إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي ۖ قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ"، یعنی یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے کہا، لفظ "إِذْ" (بمعنی جب) اس سے پہلے کی آیت میں بھی آچکا ہے، اس آیت میں "إِذْ" اسی سے بدل ہے، یعنی کیا تم اس وقت یعقوب علیہ السلام کے پاس موجود تھے جب انھوں نے اپنی موت سے پہلے اپنے بیٹوں سے کہا، کہ "مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي" تم میری وفات کے بعد کس چیز کی عبادت کروگے؟۔ "قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ"، یعنی ان کے لڑکوں نے کہا کہ ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں گے اور آپ کے باپ دادوں ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ کے معبود کی عبادت کریں گے جو ایک معبود ہے، "وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ"، اور ہم تو اس کے حکم بردار ہیں، اسی کی عبادت کرتے ہیں، بندگی اور طاعت کے لیئے صرف اسی کے سامنے جھکتے ہیں۔ یہ جملہ اپنے ماقبل سے حال بھی ہوسکتا ہے، یعنی ہم آپ کے معبود کی عبادت اس حال میں کریں گے کہ عبادت و طاعت کے لیئے ہم صرف اسی کے سامنے جھکنے والے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جملہ ابتدائیہ ہو، یعنی "ہم اس وقت بھی اور ہر حال میں اسی کے حکم بردار اور اطاعت گذار ہیں"، پہلی توجیہ حال ہونے کی زیادہ بہتر ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آیت میں اسماعیل علیہ السلام کا ذکر اسحٰق علیہ السلام سے پہلے اس لیئے ہے کہ آپ اسحاق

Marfat.com

علیہ السلام سے عمر میں بڑے تھے۔"آباء" کا لفظ باپ دادا اور چچا وغیرہ سب کے لیے ایک ساتھ استعمال ہوتا ہے، اسی طرح "امہات" کا لفظ ماں، خالہ وغیرہ سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ اسماعیل علیہ السلام یعقوب علیہ السلام کے چچا ہیں، لیکن اسی قاعدہ کے مطابق آپ کے لیے بھی "آباء" کا استعمال کیا ہے۔ ایک قراءت اس کی "اِبِیْکَ" نقل ہوئی ہے جو غلط ہے۔

"تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ" یہ ایک جماعت ہے جو گذر چکی، ان کے آگے ان کا کیا ہوا آئے گا اور تمہارے آگے تمہارا کیا ہوا، اور وہ جو کچھ کرتے رہے اس کی پوچھ گچھ تم سے نہ ہوگی) مراد ابرہیم، اسمٰعیل اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد ہے۔ خطاب یہود و نصاریٰ سے ہے کہ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی مسلم نسل کا ذکر اور ان کے عقائد و اعمال کی طرف غلط اور بے بنیاد نسبت تمہیں چھوڑ دینی چاہیئے اور یہودیت اور نصرانیت کے کفریات ان کی طرف تمہیں منسوب نہ کرنے چاہیئیں۔ وہ تو ایک جماعت تھی جو گذر چکی۔ "اُمَّةٌ" سے یہاں مراد جماعت ہے۔ "قَدْ خَلَتْ" یعنی جو گذر چکی۔ مرنے والے کے لیے کہتے ہیں "قَدْ خَلَا" یعنی دنیا کو اس نے خالی کر دیا اور یہاں کے اپنے اہل و عیال اور ساتھیوں سے جدا اور تنہا ہو گیا۔ اس کی اصل "خَلَا الرَّجُلُ" سے ہے، اس وقت بولتے ہیں جب آدمی کسی تنہائی کی جگہ چلا جائے اور وہاں اس سے بات چیت کرنے والا کوئی نہ ہو۔ اسی مناسبت سے اس کا استعمال مرنے والے کے لیے بھی ہونے لگا۔ اس کے بعد یہود و نصاریٰ سے کہا جا رہا ہے کہ اپنی گمراہی اور کفر کی نسبت جو تم میرے ان انبیاء کی طرف کر رہے ہو قطعاً بے بنیاد ہے، ان کا کیا ہوا ان کے سامنے آئے گا اور تمہارا کیا ہوا تمہارے سامنے آئے گا "لَهَا" کی ضمیر "تِلْكَ" کی طرف بھی لوٹائی جا سکتی ہے اور "اُمَّةٌ" کی طرف بھی، ایک ہی بات ہے۔" اور اے یہودیت و نصرانیت کے اختیار کرنے والو، وہ حضرات انبیاء جو کچھ کرتے رہے اس کے متعلق تم سے کوئی سوال نہیں ہوگا۔ تم سے تو اسی کی پوچھ گچھ ہوگی جو تم کرتے ہو، ہر شخص سے صرف اسی کے اعمال کے متعلق پوچھ گچھ ہوگی، ان بے بنیاد دعووں سے کیا فائدہ، اللہ کی بارگاہ میں اس کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوگا، تمہیں تو صرف تمہارے نیک و صالح اعمال ہی نفع پہنچا سکیں گے، اگر تم موت سے پہلے پہلے انھیں کر لو۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۭ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ

اور یہ (یہودی و نصرانی) لوگ کہتے ہیں کہ تم لوگ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ تم بھی راہ (حق) پر پڑ جاؤ گے۔ آپ (جواباً) کہہ دیجیے کہ ہم تو ملتِ ابراہیمؑ

حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

(یعنی اسلام) پر رہیں گے جس میں کجی کا نام نہیں اور ابراہیم علیہ السلام مشرک کبھی نہ تھے

ابراہیم علیہ السلام کا دین حنیفیت اور اسلام تھا

"وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا" یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ سے یہودیوں نے کہا کہ یہودی ہو جاؤ تو راہ پا جاؤ گے، اور نصرانیوں نے یہ کہا کہ نصرانی ہو جاؤ تو راہ پا جاؤ گے۔ "تَهْتَدُوْا" یعنی حق کا راستہ پا جاؤ گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن صوریا اعور یہودی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہدایت تو صرف اسی راستہ میں ہے جس پر ہم ہیں، اے محمد! ہماری اتباع کر لیجیے تو آپ لوگ بھی راہ پا جائیں گے۔ اسی طرح کی بات نصاریٰ نے بھی آں حضورؐ سے کہی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ آں حضورؐ سے اس طرح کی باتیں کرنے والوں کے خلاف یہ نہایت مختصر، بلیغ اور واضح دلیل ہے

Marfat.com

اللہ نے بڑی صفائی کے ساتھ فرمایا کہ اے محمد، جو لوگ آپ سے اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے آکر یہ کہتے ہیں کہ یہودی اور نصرانی ہو جاؤ تو راہ پا جاؤ گے، ان سے آپ کہہ دیجئے کہ یہودیت اور نصرانیت کے اختلافات میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے، آؤ، ہم سب مل کر ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین و ملت کی اتباع کریں، جس کے متعلق ہم سب کی گواہی ہے کہ وہ اللہ کا دین ہے اور حق ہے، اللہ اس دین سے خوش تھا اور اس پر قائم رہنے کا اس نے حکم دیا تھا۔ دوسری تمام ملتوں میں تو ہمارے درمیان اتنے شدید اختلافات ہیں کہ ایک فرقہ جسے دین حق سمجھتا ہے دوسرا فرقہ اس کی بھرپور تردید کر دیتا ہے، اختلاف و نزاع کے اس اندھیرے میں ایک جگہ مل کر بیٹھنے اور باہمی اتفاق پیدا کرنے کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں۔ البتہ ابراہیم علیہ السلام کی ملّت پر ہم سب کا اجتماع و اتفاق ممکن ہے، اس لیے ہم سب کو ابراہیم علیہ السلام کے دین پر جو حنیفیت اور اسلام تھا جمع ہو جانا چاہیے، خود اہلِ کتاب میں نزاع و اختلاف کا جو طوفان برپا ہے، اس سے نجات پانے کی بھی صرف یہی صورت ہے۔

آگے کی آیت "بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ" میں "مِلَّةَ" کو نصب ہونے کی تین وجہیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ "كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصَارٰى" کو "اِتَّبِعُوا الْيَهُوْدِيَّةَ وَالنَّصْرَانِيَّةَ" (یہودیت اور نصرانیت کی اتباع کر لو) کے معنی میں لیا جائے اور اس کا جواب "بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ" کو تسلیم کیا جائے۔ اس صورت میں تقدیر عبارت یہ ہو گی کہ "قُلْ يَا مُحَمَّدُ لَا نَتَّبِعُ الْيَهُوْدِيَّةَ وَالنَّصْرَانِيَّةَ بَلْ نَتَّبِعُ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ" (اے محمد، کہہ دیجئے کہ ہم یہودیت اور نصرانیت کی اتباع نہیں کریں گے، بلکہ ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی اتباع کریں گے)۔ پھر دوسرے "نَتَّبِعُ" کو حذف کر دیا اور "مِلَّةَ" کا "اَلْيَهُوْدِيَّةَ وَالنَّصْرَانِيَّةَ" کے اعراب پر عطف کر دیا گیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "نَتَّبِعُ" کے ہم معنی ایک فعل مقدر کی وجہ سے لسے نصب ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اصل عبارت یوں تھی "بَلْ نَكُوْنُ اَصْحَابَ مِلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ" (بلکہ ہم ابراہیمؑ کی ملّت والوں میں سے ہوں گے) "اَصْحَابَ" کو حذف کر دیا گیا اور "مِلَّةَ" کو اعراب و معنی میں اس کے قائم مقام بنا دیا گیا۔ "قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" (آپ کہہ دیجئے کہ ہم نے تو ابراہیمؑ سیدھی راہ والے کا مذہب پا لیا، اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے)۔

"ملّت" بمعنی دین ہے۔ "حَنِيْفٌ" کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو سیدھی اور مستقیم ہو۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد! آپ کہہ دیجئے کہ بس ہم تو ملت ابراہیمی کی اتباع کریں گے جو سیدھی اور مستقیم ہے۔ اس صورت میں "حَنِيْفًا" حال ہو گا۔ مفسرین کے اس لفظ کے مفہوم کے سلسلے میں مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں

ایک قول یہ ہے کہ "حَنِيْفٌ" کے معنی حج کرنے والے، حاجی کے ہیں، اس قول کے مطابق کہا جاتا ہے کہ دین ابراہیمی کا نام اسلام اور حنیفیت اس لیے پڑا کہ سب سے پہلے آپ نے ہی اپنے زمانہ اور اس کے بعد قیامت تک کے انسانوں کے لیے مناسک حج میں اپنی اتباع کو ضروری قرار دیا، چنانچہ جو شخص بھی حج بیت اللہ کرتا ہے اور ان کے طریقوں کے مطابق ادائیگی مناسک کرتا ہے تو وہ مسلم اور حنیف ہے، اور ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہے۔ حسن، عطیہ، مجاہد، ضحاک رحمہم اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل ہوا ہے۔

عبداللہ بن قاسم سے بھی یہی روایت ہے، آپ نے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں قبیلہ مضر کے لوگ حج کے لیے جاتے اور حج کر لینے والوں کو "حُنَفَاءُ" (حنیف کی جمع) کہتے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد "حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ" (جھکے رہو اللہ کی طرف اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر کے) میں اس طرف اشارہ موجود ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "حَنِيْفٌ" اتباع کرنے والے کے معنی میں ہے۔ یہ قول بھی مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہوا ہے۔

Marfat.com

تیسرا قول یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دین کو "حنیفیت" اس لیے کہا گیا کہ آپ امام ہیں، اور انسانوں کے لیے ختنہ آپ ہی کی سنت ہے، پھر بعد میں لوگوں نے آپ ہی کی اتباع میں ختنہ کیا، پس جو شخص بھی ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کے مطابق ختنہ کرائے گا وہ اس دین پر سمجھا جائے گا جس پر ابراہیم علیہ السلام تھے اور ایسے "حنیف" کہا جائے گا۔

چوتھا قول یہ ہے کہ "حَنِیف" بمعنی مخلص ہے، یعنی اپنے دین کو صرف اللہ ہی کے لیے خالص کرنے والا۔ یہ قول سدی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہوا ہے۔

پانچواں قول یہ ہے کہ "حنیفیت" اسلام ہے، پس جو کوئی بھی ابراہیم علیہ السلام کی دینی معاملات میں اتباع کرے گا اور اس پر استقامت اختیار کرے گا وہ "حنیف" ہے۔

میرے نزدیک "حنیف" کا مفہوم "ابراہیم علیہ السلام کے دین پر استقامت اور آپ کے دین میں آپ کی اتباع" ہے۔ اگر "حنیفیت" سے مراد حج بیت اللہ لے لیا جائے، تو جو لوگ جاہلیت میں حج بیت اللہ کرتے تھے اور مشرک تھے انھیں بھی "حنیف" ماننا پڑے گا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نفی کی ہے۔ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (جھکنے والے تھے مسلم تھے اور مشرکین میں سے نہیں تھے) ختنہ کا بھی یہی معاملہ ہے۔ یہودی بھی ختنہ کراتے ہیں، اور "حنیفیت" اگر ختنہ کرانے کے معنی میں ہو تو یہود بھی "حنفاء" کہلانے کے مستحق ٹھہرتے ہیں، لیکن قرآن مجید خود اس کی تردید کرتا ہے، ارشاد ہے کہ "ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے، بلکہ وہ حنیف مسلم تھے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "حنیفیت" نہ تنہا ختنہ کرانے کا نام ہے اور نہ صرف حج بیت اللہ کا، بلکہ پورے دینِ ابراہیمی پر استقامت اور اس کی اتباع کا نام ہے۔ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے انبیاء بھی سیدھے راستے پر تھے اور اللہ کی طرف سے جو انھیں حکم ملا تھا اس کی پوری طرح اتباع کرتے تھے، لیکن خاص ابراہیم علیہ السلام کی طرف "حنیفیت" کی نسبت اس لیے کی گئی ہے کہ آپ سے پہلے کے انبیاء کو ان کے بعد آنے والی نسلوں کے لیے امام و پیشوا بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا، یہ صرف ابراہیم علیہ السلام کی خصوصیت ہے کہ آپ کو قیامت تک کے لیے امام و پیشوا بنایا گیا، اور جس طرح آپ کے زمانہ کے لوگوں کو آپ کی اتباع کا حکم تھا، اسی طرح قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے بھی حکم ہے کہ آپ کے مناسک حج، ختنہ اور دوسرے شرائع اسلام میں اتباع کریں۔ یہ امور جو سنت ابراہیمی کہلاتے ہیں علامت اور نشان ہیں مومن اور کافر، اور فرماں بردار و نافرمان کے درمیان، اسی لیے حنیف اس شخص کو کہا گیا جسے آپ کی ملت کی اتباع میں استقامت ہو اور جو آپ کے طریقوں اور سنتوں پر چلنے والا ہو۔ اس کے برعکس جو لوگ آپ کے دین سے ہٹ گئے اور دوسرے راستے اختیار کر لیے ان میں کوئی یہودی ہے، کوئی نصرانی اور کوئی مجوسی وغیرہ۔

"وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ" یعنی وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو بت پرستی کا دین اختیار کیے ہوئے ہیں، وہ یہودی اور نصرانی نہیں تھے، بلکہ حنیف مسلم تھے۔

قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ

(مسلمانو) کہدو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اُس (حکم) پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس پر بھی جو (حضرت) ابراہیم ؑ

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسـ

اور (حضرت) اسمٰعیل ؑ اور (حضرت) اسحٰق ؑ اور (حضرت) یعقوب (علیہم السلام) اور اولاد یعقوب ؑ (میں جو نبی گذرے ہیں اُن) کی طرف بھ

Marfat.com

وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ

اور اس (حکم و معجزہ) پر بھی جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو دیا گیا اور اس پر بھی جو کچھ اور انبیاء (علیہم السلام) کو دیا گیا انکے پروردگار کی طرف سے۔ اس کیفیت سے کہ ہم ان (حضرات)

مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ○

میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے۔ اور ہم تو اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں ؛

سیدھا اور بے خطر راستہ

یعنی اے مؤمنو، ان یہود و نصاریٰ سے، جو تمھیں یہودیت اور نصرانیت کی طرف بلاتے ہیں، کہدو کہ "اٰمَنَّا بِاللّٰهِ" ہم تو اللہ کی تصدیق کرتے ہیں "وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا" یعنی اور ہم اس کتاب کی تصدیق کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہے "إِلَيْنَا"، کا اصل مفہوم تو یہ ہے کہ جو کتاب "ہم پر"، اتاری گئی، کتاب اگرچہ حضور اکرم صؐ پر اتاری گئی تھی، لیکن مؤمنین کی طرف اس کی نسبت اس لیئے کی گئی کہ وہی اس کی اتباع کرنے والے تھے، اس کے حکم و نہی پر چلنے والے تھے، قرآن مجید براہِ راست اگرچہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، لیکن بالواسطہ اس حیثیت سے اس کا نزول مؤمنین پر بھی ہوا کہ وہ اس کی اتباع کرنے والے ہیں۔

"وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ"، یعنی ہم اس کی بھی تصدیق کرتے ہیں جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اسباط پر اتارا گیا تھا۔ "أَسْبَاط"، سے مراد یعقوب علیہ السلام کی اولاد (بنی اسرائیل) کے انبیاء ہیں۔

"وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ"، یعنی ہم تورات کی بھی تصدیق کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو دی تھی اور انجیل کی بھی تصدیق کرتے ہیں اور اسی طرح ان تمام آسمانی کتابوں کی ہم تصدیق کرتے ہیں جو انبیاء کو دی گئیں، ہم اقرار کرتے اور دل سے مانتے ہیں کہ یہ سب حق، ہدایت اور اللہ کی طرف سے نور ہیں، اور جتنے انبیاء کا اللہ نے ذکر کیا ہے سب حق اور ہدایت پر تھے اور سب نے اللہ کی توحید کی اور اس کی اطاعت کی طرف بلانے میں ایک دوسرے کی تصدیق کی ہے۔

"لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ"، (ہم ان میں سے کسی کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے) یعنی ہم ایسا نہیں کرتے کہ بعض انبیاء کی تو تصدیق کریں اور بعض کا کفر کریں، بعض کو اپنا بنائیں اور بعض سے برارت کریں، جیساکہ یہود نے کیا اور عیسیٰ اور محمد صلی اللہ علیہما وسلم کی تکذیب کی اور دوسرے انبیاء کی تصدیق کی، اور جیساکہ نصاریٰ نے کیا، کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی اور دوسرے انبیاء کی تصدیق کی، بلکہ سب کے حق میں ہماری گواہی ہے کہ وہ اللہ کے رسول اور نبی تھے اور حق کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔

"وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ"، یعنی "اور ہم صرف اللہ ہی کی طاعت کے لیئے دل سے جھکنے والے ہیں اور عبودیت و بندگی صرف اسی کی کرتے ہیں"۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چند یہودی جن میں ابو یاسر بن اخطب، رافع بن ابی رافع، عازر، خالد، زید، ازار بن ابی ازار اور اشیع بھی تھے، حاضر ہوئے اور سوال کیا کہ آپ کن پر ایمان رکھتے ہیں؟ آں حضور صؐ نے فرمایا، کہ میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں، اس پر ایمان رکھتا ہوں جو ہم پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل کیا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور اس پر جو دوسرے تمام انبیاء کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، ہم ان میں سے کسی کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے، اور ہم صرف اللہ ہی کے طاعت گذار ہیں۔ جب آں حضور صؐ نے عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا تو یہودی ان کی

نبوت کا انکار کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ہم عیسیٰ کو نہیں مانتے اور لسے بھی نہیں مانتے جو اُن پر ایمان رکھتا ہو اور ان کی تصدیق کرتا ہو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ”قُل یا اھل الکتاب ھل تنقمون منا الا ان امنا باللہ وما انزل الینا وما انزل من قبل وان اکثرکم فاسقون“۔ آپ کہدیجئے کہ اے اہل کتاب، تم ہم سے بس یہی ضد رکھتے ہو نا کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور جو کچھ ہمارے اوپر اترا ہے اس پر اور جو کچھ ہم سے پیشتر اُتر چکا ہے اس پر؟ اور بلاشبہ تم میں سے اکثر نافرمان ہیں “

”اَسباط“، یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کہتے ہیں، آپؑ کے بارہ صاحبزادے تھے، اور پھر ہر ایک سے ایک ایک نسل چلی، انھیں کو ”اسباط“ کہتے ہیں، یہ روایت قتادہ، سدی، ربیع اور محمد بن اسحاق سے ہے۔ سدی کی روایت میں ان کے نام یہ ہیں:۔ یوسف، بنیامین، روبیل، یہوذا، شمعون، لاوی، وان اور تہات۔ محمد بن اسحاق کی روایت میں ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے، جن کا دوسرا نام اسرائیل بھی تھا، لپنے ماموں کی صاحبزادی ”لیا بنت لیان بن توبیل“، سے پہلی شادی کی۔ ان کے بطن سے روبیل، شمعون، لاوی، یہوذا، ریالون اور لیشجر اور ایک صاحبزادی دینہ پیدا ہوئیں۔ روبیل سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ پھر لیا بنت لیان کا انتقال ہو گیا اور ان کے بعد یعقوب علیہ السلام نے انھیں کی بہن ”راحیل“ سے دوسری شادی کی۔ آپ کے بطن سے یوسف علیہ السلام اور بنیامین پیدا ہوئے۔ اس کے علاوہ آپ کی دو باندیاں تھیں جن کا نام ”زلفہ“ اور ”بلہیہ“ تھا۔ ان کے بطن سے چار لڑکے ہوئے، دان، نفتالی جاد اور اشرب۔ اس طرح یعقوب علیہ السلام کے یہاں بارہ لڑکے پیدا ہوئے، جن کی اللہ تعالیٰ نے بارہ نسلیں چلائیں، یہ سلسلہ اتنا وسیع ہوا اور پھیلا کہ ان کا شمار بھی نہیں کیا جا سکتا اور نہ اللہ کے سوا ان کی نسلوں کا کسی کو صحیح علم ہے۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ج

سو اگر وہ بھی اسی طریق سے ایمان لے آویں جس طریق سے تم (اہلِ اسلام) ایمان لائے ہو تب تو وہ بھی راہِ حق پر لگ جاویں گے

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ج فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ج وَهُوَ

اور اگر وہ روگردانی کریں تو وہ لوگ تو (ہمیشہ سے) برسرِ مخالفت ہیں ہی تو سمجھ لو کہ (تمہاری طرف سے) عنقریب ہی نمٹ لیں گے ان سے اللہ تعالیٰ اور

السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ صِبْغَةَ اللّٰهِ ج وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ز

اللہ تعالیٰ سنتے ہیں جانتے ہیں ہم (دین کی) اس حالت پر رہیں گے جس میں (ہم کو) اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے اور (دوسرا) کون ہے جس کے رنگ دینے کی

وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا

حالت اللہ تعالیٰ سے خوبتر ہو اور (اسی لیے) ہم اسی کی غلامی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ آپ (اُن سے) فرما دیجئے کہ کیا تم لوگ ہم سے (اب بھی) حجت کیے جاتے ہو حق تعالیٰ

وَرَبُّكُمْ ج وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ج وَنَحْنُ

کے معاملہ میں حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا (سب کا) رب ہے۔ اور ہم کو ہمارا کیا ہوا ملیگا اور تم کو تمہارا کیا ہوا ملے گا اور ہم نے صرف

لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۝ لا

حق تعالیٰ (کی خوشنودی) کے لیے اپنے (دین) کو (شرک وغیرہ سے) خالص کر رکھا ہے

Marfat.com

معیار

"فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا" یعنی اگر یہود ونصاریٰ بھی اللہ پر، اس کی تمام کتابوں پر اور اس کے تمام نبیوں پر ایمان لے آئیں اور ان کا اسی طرح اقرار وتصدیق کریں جس طرح تم نے کی ہے تو یقیناً انھیں بھی توفیق مل گئی اور وہ بھی ہدایت اور حق پر آگئے اور اب وہ تمہارے ہی ایک فرد ہیں اور تم ان کے ہو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کا کوئی عمل اس وقت تک اللہ کے یہاں قبول نہیں کیا جائے گا جب تک وہ ان امور پر ایمان نہ رکھتا ہو اور ان کی تصدیق نہ کرتا ہو جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ایمان ہی "عروۃ وثقیٰ" ہے، کوئی عمل اس کے بغیر قبول نہیں ہو سکتا اور جنت اسی پر حرام ہوگی جو ایمان نہ رکھتا ہو۔

"وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ" انھیں کے متعلق ارشاد ہے جنھوں نے آں حضور ص اور آپ کے صحابہ رض سے کہا تھا کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تو راہ پا جاؤ گے۔ یعنی "اور اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو پھر بلاشبہ بڑی مخالفت میں ہیں" اگر وہ تمہاری طرح ایمان نہیں لاتے، بلکہ اللہ کے رسولوں میں فرق کرتے ہیں اور بعض پر تو ایمان لاتے ہیں اور بعض کا کفر کرتے ہیں، تو پھر یہ بڑے گناہ اور مخالفت میں ہیں اور اللہ، اس کے رسول اور تم سے لڑائی مول لے رہے ہیں۔

"شِقَاق" کا مفہوم قتادہ اور ربیع سے "فراق، مخالفت" نقل ہوا ہے۔ ابن زید نے فرمایا کہ "شقاق" کے معنی آگ اور جنگ کے ہیں۔ کلام عرب میں "شَاقَّ" اور "حَارَبَ" ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ صحیح علم اللہ کو ہے، لیکن ہمارے نزدیک "شِقَاق" کی اصل "شَقَّ عَلَيْهِ هٰذَا الْاَمْرُ" سے ہے، اس وقت بولتے ہیں جب کوئی چیز کسی کے لیے باعث اذیت وتکلیف ہو جائے، اسی سے "شَاقَّ فُلَانٌ فُلَانًا" استعمال ہونے لگا، یعنی جانبین کو ایک دوسرے سے تکلیف دہ باتیں پہنچیں۔

"فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ" یعنی پس اے محمد، اللہ آپ کی طرف سے ان کے لیے کافی ہے" اگر وہ آپ کی طرح ایمان نہیں لاتے، بلکہ اللہ کے رسولوں میں فرق کرتے ہیں تو آپ ان کے معاملہ کو اللہ پر چھوڑ دیجیے، وہی ان کے حق میں تلوار کا، جلاوطنی کا یا اسی طرح کی کسی اور سزا کا فیصلہ کر دے گا۔

"وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ" کہ اللہ بڑا سننے والا ہے، وہ جو کچھ کہتے ہیں اور جس طرح آپ کے سامنے جہالت کا مظاہرہ کرتے ہیں، اللہ سب کچھ سنتا ہے "اَلْعَلِيْمُ" بڑا جاننے والا ہے، آپ کے لیے اور آپ کے مؤمن ساتھیوں کے لیے انھوں نے اپنے دل میں جو حسد اور بغض چھپا رکھا ہے، اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کیا، اور بہت جلد آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر غالب کر دیا، اس کے نتیجہ میں ان میں سے بہت سے قتل ہوئے، بہتوں کو جلاوطن کیا گیا، بہتوں کو اللہ نے ان کی سرکشی کے نتیجہ میں ذلیل کیا اور چھوٹا بن کر انھیں جزیہ دینا پڑا۔

"صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً" صِبْغَة (بمعنی رنگ) سے مراد اسلام کا رنگ ہے۔ نصاریٰ کے یہاں جب بچہ ہوتا ہے تو انھیں نصرانی بنانے کے لیے ان پر ایک خاص قسم کا پانی ڈالتے ہیں (بپتسمہ) جو ان کے خیال کے مطابق پاکی اور طہارت ہے، جس طرح اہل اسلام کے یہاں غسلِ جنابت باعثِ طہارت ہے۔ گویا یہ نصرانیت میں لانے کے لیے ان کا ایک رنگ ہے، نصرانیت کا رنگ!۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رض سے انھوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے، تو اللہ نے فرمایا کہ اے محمد، آپ انھیں یہ جواب دے دیجیے کہ اے یہود ونصاریٰ، بلکہ خود تمھیں ملتِ ابراہیمی کی اتباع کرنی چاہیے، "جو اللہ کا رنگ ہے، اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہوگا!" یہی حنیفیت اور اسلام کا رنگ ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یہودی اپنے

Marfat.com

بچوں کو یہودی بنانے کے لیے ان پر رنگ ڈالتے تھے اور نصاریٰ اپنے بچوں کو نصرانی بنانے کے لیے رنگ ڈالتے تھے، لیکن اللہ کا رنگ اسلام ہے پس کوئی رنگ اسلام سے زیادہ بہتر اور پاک نہیں، یہی اللہ کا وہ دین ہے جس کے ساتھ اس نے نوح علیہ السلام اور آپ کے بعد تمام انبیاء کو مبعوث کیا۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہودی اپنے بچوں کو یہودی بنانے کے لیے رنگ ڈالتے تھے جو فطرت کے خلاف تھا۔

" صِبْغَةَ اللّٰهِ " کی تفسیر میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ قتادہ، ابو العالیہ، ربیع، مجاہد، عطیہ، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کی تفسیر " اللہ کا دین " (دِيْنَ اللّٰهِ) نقل ہوئی ہے۔ اس کے مطابق " وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ دِيْنًا " کا مفہوم یہ ہوگا کہ " اور اللہ سے بہتر دین کس کا ہوگا "

دوسرا قول یہ ہے کہ " صِبْغَةَ اللّٰهِ " سے مراد " اللہ کی فطرت " " فِطْرَةَ اللّٰهِ " ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ ہی سے یہ قول بھی نقل ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ " صِبْغَةَ اللّٰهِ " یعنی اللہ کی فطرت، اس کی تخلیق جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ عبد اللہ بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس سے مراد " اللہ کا دین " ہے، " اور اس سے کس کا دین بہتر ہوگا "، فرمایا کہ یہی اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ جن حضرات نے " صبغۃ " کو فطرت کے معنی میں لیا ہے، ان کے یہاں آیت کی تفسیر یہ ہوگی " بلکہ ہم اللہ کی فطرت اور اس کی ملت کی اتباع کریں گے جس پر اس نے مخلوق کو پیدا کیا، اور یہی دین قیم ہے۔

" وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ " اس میں بھی آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ ان یہود و نصاریٰ سے کہد یجئے کہ ہم تو ملت ابراہیمؑ کی اتباع کریں گے، جو اللہ کا رنگ ہے " اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے ہیں " یعنی ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملت کو اختیار کر کے ہم اللہ کی بندگی کے لیے جھکنے والے اور عاجزی و زاری اختیار کرنے والے بن جائیں گے، اللہ کے حکم کے ساتھ تکبر کرنے والے اور اس کے سامنے غرور و پندار کا مظاہرہ کرنے والے ہم نہیں بننا چاہتے۔ جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کر کے کیا۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِى اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ " (آپ کہیے کہ کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کرتے ہو، حالانکہ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے اور ہمارے عمل ہمارے لیے ہیں اور تمہارے عمل تمہارے لیے ہیں اور ہم تو اسی کے لیے مخلص ہیں) یہ خطاب انھیں یہود و نصاریٰ سے ہے جنھوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضہ سے یہودی اور نصرانی ہو جانے کو کہا تھا اور جو کہتے تھے کہ ان کا دین و کتاب آں حضورؐ کے دین و کتاب سے بہتر ہے۔ ان کے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی کتاب پرانی تھی اور آں حضورؐ سے بہت پہلے نازل ہوئی تھی۔ ارشاد ہے کہ اے محمد، ان سے کہد یجئے کہ کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کرتے ہو، حالانکہ وہی تمہارا بھی رب ہے اور ہمارا بھی رب ہے۔ اسی کے ہاتھ میں تمام بھلائیاں ہیں اور وہی اچھے اور برے اعمال پر جزاء و سزا دیتا ہے، پھر تم آخر یہ کس طرح کہتے ہو کہ صرف اس وجہ سے کہ تمہارے نبی اور تمہاری کتاب چوں کہ ہمارے نبی اور ہماری کتاب سے پہلے تھی، اس لیے تم اچھے ہو اور تمہارا دین سب سے بہتر ہے جو تمہارا رب ہے وہی ہمارا بھی ہے، جزاء و سزا اور اچھا اور برا ہونا تو عمل پر موقوف ہے، صرف نسب اور دین یا کتاب کی قدامت پر کسی کو بھی سزا و جزاء نہیں ملتی، جو جیسا عمل کرے گا ویسا ہی پھل پائے گا۔

" قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا " یعنی " آپ کہیے کہ کیا تم ہم سے حجت کرتے ہو، جھگڑتے ہو " ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد اور ابن زید رحمہما اللہ سے اس کی یہی تفسیر نقل ہے۔

Marfat.com

"ونحن له مخلصون"، یعنی ہم تو عبادت وطاعت میں اللہ ہی کے لیے خالص ہیں، اس کا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے، اور نہ بت پوجنے والوں اور گوسالہ پرستی کرنے والوں کی طرح اللہ کے سوا ہم کسی کی عبادت کرتے - یہ اللہ کی طرف سے یہودیوں کو توبیخ ہے ارشاد ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اے مومن ساتھیو، ان یہود و نصاریٰ سے کہدو جو تمھیں یہودیت اور نصرانیت کی طرف بلاتے ہیں کہ کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کرتے ہو، "فی اللہ"، یعنی اللہ کے دین کے بارے میں، جس دین پر چلنے کا ہمیں اس نے حکم دیا ہے، حالانکہ ہمارا اور تمہارا رب ایک ہے، وہ نہ ہم پر ظلم کرے گا اور نہ تم پر، وہ عادل ہے، اس لیے تمام بندوں کو ان کے عمل کے مطابق بدلہ دے گا، تم صرف اس وجہ سے کہ تمہارا دین پرانا ہے، تمہاری کتاب اور تمہارے نبی پرانے ہیں یہ سمجھتے ہو کہ بس تمھیں سب سے بہتر ہو، تمہاری یہ کتنی بڑی خام خیالی ہے، کیا تم اسے بھی نظر انداز کر دو گے کہ تمہاری طاعت وعبادت بھی اللہ کے لیے خالص نہیں، تم میں سے ایک گروہ (یہودیوں) نے گوسالہ کی پوجا شروع کر دی تھی اور دوسرا گروہ (نصاریٰ) مسیح علیہ السلام کی عبادت کرتا ہے، خالص اللہ کی عبادت کرنے والے اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرنے والے تو صرف ہم ہیں، کیا پھر بھی تم اللہ کے یہاں ہم سے بہتر ہو جاؤ گے -

أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرٰهٖمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ

یا کہے جاتے ہو کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب

وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصٰرٰى ۗ قُلْ أَأَنْتُمْ أَعْلَمُ

یہود یا نصاریٰ تھے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہدیجیے کہ (اچھا یہ بتلاؤ کہ) تم

أَمِ اللّٰهُ ۗ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ

زیادہ واقف ہو یا حق تعالیٰ اور ایسے شخص سے زیادہ ظالم کون ہو گا جو ایسی شہادت کا اخفاء کرے جو اس کے پاس منجانب اللہ

اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ○ تِلْكَ أُمَّةٌ

پہنچی ہو اور (اے اہل کتاب) اللہ تعالیٰ تمہارے کیے ہوئے سے بے خبر نہیں ہیں یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت

قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ ۚ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ

تھی جو گذر گئی ان کے کام ان کا کیا ہوا آئے گا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آوے گا۔

وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○

اور تم سے ان کے کیے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہو گی۔

"أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارٰى ۗ قُلْ أَأَنْتُمْ أَعْلَمُ	اللہ تم سے زیادہ جانتا ہے

Marfat.com

اَمِ اللّٰہُ "۔

"اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ" کی قراءت دو طرح نقل ہوئی ہے، ایک "تا" کے ساتھ، جیسا کہ آیت میں موجود ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف "اَتُحَآجُّوۡنَنَا فِی اللّٰہِ" پر ہوگا، یعنی اے محمد، ان یہود و نصاریٰ سے کہہ دیجیے کہ کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے حجت کرتے ہو یا پھر تمہارا یہ خیال ہے کہ ابراہیم علیہ السلام بھی یہودی اور نصرانی تھے۔ دوسری قراءت میں "اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ" یا کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف ماقبل کے جملہ پر نہیں ہوگا، بلکہ یہاں سے ایک الگ جملہ شروع ہوگا، جملہ استفہامیہ مستانفہ! ۔ یعنی کیا یہود و نصاریٰ یہ کہتے ہیں" الخ۔ میرے نزدیک صحیح پہلی ہی قراءت ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ کیا تم اللہ کے دین کے بارے میں حجت کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ تمہی سب سے افضل ہو اور ہدایت پر بھی صرف تمہی ہو، حالانکہ ہم سب کا رب ایک ہے، یا پھر تم یہ سمجھتے ہو کہ "ابراہیم، اسماعیل اسحٰق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب یہودی یا نصرانی تھے" اور تمہارے مذہب پر تھے، تاکہ تم جو تہمت ان پر رکھ رہے ہو اس کے لیے جواز پیدا کرسکو۔ کیا یہ بات کوئی ڈھکی چھپی ہے کہ یہودیت و نصرانیت بعد میں وجود میں آئی ہیں، اور یہ انبیاء تو اس سے بہت پہلے اللہ کے دین حنیف پر قائم تھے اور اسی کی دعوت انھوں نے دی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ تم ان دونوں میں سے کیا کہنا چاہتے ہو، کیا تم اللہ کے بارے میں حجّت کرتے ہو۔ اور سمجھتے ہو کہ تمہارا دین افضل ہے، تم ہدایت پر ہو اور ہم گمراہی میں مبتلا ہیں، کیا تم جو ہمیں اپنے دین کی دعوت دے رہے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے؟ پھر تمھیں کوئی دلیل بھی پیش کرنی چاہیے تاکہ ہم تمہاری ہی اتباع کرلیں اور تمہارے کہنے کے مطابق ہدایت پاجائیں، یا تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور آپ کی اولاد یہودیت اور نصرانیت پر تھے؟ یہ دعویٰ بھی محتاج دلیل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ حضرات انبیاء امام و پیشوا تھے اور اس لیے ان کی اتباع کرنی چاہیے، لیکن یہ بات کہ یہ حضرات تمہارے ہی دین پر قائم تھے اس وقت تک قابلِ قبول نہیں ہوسکتی جب تک تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہ ہو، بلکہ اس کے برعکس یہ سب جانتے ہیں کہ یہ نام تم خود گھڑ لیے ہیں، انھیں تمہارے دین سے کوئی سروکار کیا ہو سکتا ہے۔ تم تو ان کے بنائے ہوئے راستے سے ہٹ کر اپنی خواہشات کی اتباع میں لگے ہوئے ہو اور تمہارا پندار کسی طرح تمھیں قبولِ حق کی طرف نہیں آنے دیتا، قُلۡ ءَاَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ اَمِ اللّٰہُ "آپ کہیے کہ تم ان کے دین اور طریقے کے بارے میں زیادہ واقف ہو یا اللہ؟"۔

"وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ کَتَمَ شَہَادَۃً عِنۡدَہٗ مِنَ اللّٰہِ" (اور اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اس شہادت کو چھپائے جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے پہنچ چکی ہے) انھیں یہود و نصاریٰ کے متعلق ارشاد ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے، کہ ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا، ان کے پاس اللہ کے پاس سے شہادت پہنچ چکی ہے کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب علیہم السلام مسلم تھے، حنیفیت پر قائم تھے، لیکن وہ اس شہادت کو چھپاتے ہیں اور اس کے بجائے انھوں نے یہودیت و نصرانیت ایجاد کرلی ہے اور اپنی خواہشات کے مطابق اسی اپنے ایجاد کیے ہوئے راستوں پر چل رہے ہیں۔

"مِمَّنۡ کَتَمَ شَہَادَۃً عِنۡدَہٗ مِنَ اللّٰہِ" کی تفسیر کے سلسلے میں کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔ مجاہد، حسن اور ربیع رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں جو ابراہیم و اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کے متعلق کہتے تھے کہ یہ حضرات یہودی یا نصرانی تھے۔

Marfat.com

آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی شہادت ہے تو تمھیں چھپانا نہ چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔

حسن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہودیت اور نصرانیت سے انبیاء کی برأت معلوم تھی اور اس کی ان کے پاس اس طرح شہادت موجود تھی جس طرح اس بات کی کہ ناحق ان میں سے کسی ایک کے لیئے دوسرے بھائی کا مال اور اس کی جان حرام ہے، اور اس کے باوجود اسے انھوں نے حلال کر رکھا تھا۔

ربیع رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں مزید وضاحت یہ ہے کہ وہ توریت و انجیل میں لکھا ہوا پاتے تھے کہ انبیاء علیہم السلام یہودی یا نصرانی نہیں تھے، بلکہ یہ نام تو بعد کی ایجاد ہیں۔ اس لیئے تم ایک غلط بات ان کی طرف منسوب کر رہے ہو جنھیں خود تم اپنا رسول اور اپنا ہادی و پیشوا تسلیم کیئے ہوئے ہو۔ ہم بھی انھیں حق پر مانتے ہیں، اور اس لیئے ہم اور تم کم از کم اس نقطہ پر متفق ہیں، اختلاف صرف اس میں ہے کہ ان کا طریقہ اور دین کیا تھا؟۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہود و نصاریٰ کا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو چھپانا ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق وہ اپنی کتابوں میں لکھا ہوا پاتے تھے اور آپ کی صفات سے وہ آپ کو خوب پہچانتے تھے۔ یہ قول قتادہ، ربیع اور ابن زید رحمہم اللہ سے منقول ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک بہتر قول پہلا ہی ہے، کیوں کہ پہلے ہی سے چند مخصوص انبیاء کا نام کے ساتھ ذکر ہو رہا ہے، اس لیئے بہتر ہے کہ اس آیت میں بھی انھیں کے متعلق شہادت چھپانا مراد ہو

جو شہادت یہود و نصاریٰ چھپاتے تھے اور جس کا ذکر توریت و انجیل میں تھا وہ یہ تھی کہ ان انبیاء کے طریقوں اور سنتوں کی اتباع کی جائے، یہ حضرات انبیاء حنیفیت اور اسلام پر قائم تھے، اور یہی وہ شہادت تھی جسے انھوں نے اس وقت چھپایا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اسلام کی طرف بلایا، اور بجائے بات مان لینے کے کہنے لگے کہ جنت میں یہود و نصاریٰ کے سوا اور کوئی نہیں جائے گا، اور اگر ہدایت چاہتے ہو تو تم بھی یہودی یا نصرانی ہو جاؤ۔ ان کے ان دعوؤں کی تردید کے لیئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل کیں۔

" وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ " یعنی اے محمد، ان یہود و نصاریٰ سے کہدیجیئے " کہ اللہ غافل نہیں ہے تمہارے کرتوتوں سے۔ اپنی کتاب میں اس نے تم پر یہ لازم کیا تھا کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب علیہم السلام کی اسلام اور حنیفیت میں اتباع کریں، اور یہ کہ حنیفیت اور اسلام ہی اللہ کا دین ہے جسے یہود و نصاریٰ سمیت تمام انسانوں کو اختیار کرنا چاہیئے، لیکن تم اس حق کو چھپاتے ہو، تو اللہ اس سے غافل نہیں ہے، اس لیئے تمھیں اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد آخرت میں بھی اللہ کے عذاب کے لیئے تیار رہنا چاہیئے۔

" تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ "
(یہ ایک جماعت ہے جو گذر چکی ان کا کیا ہوا ان کے آگے آئے گا اور تمہارا کیا ہوا تمہارے آگے آئے گا اور جو کچھ وہ کرتے رہے اس کی پوچھ گچھ تم سے نہ ہوگی)

" تِلْكَ اُمَّةٌ " (یہ ایک جماعت ہے) سے مراد ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب علیہم السلام ہیں۔ قتادہ اور ربیع رحمہما اللہ سے بھی یہی نقل ہوا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد، یہود و نصاریٰ جو آپ سے حجت کرتے ہیں اور جنھوں نے انبیاء کے متعلق اللہ کی طرف

Marfat.com

سے آنے والی شہادت کو چھپا رکھا ہے اور اس کے بجائے یہ کہتے ہیں کہ یہ حضرات بھی یہودی اور نصرانی تھے، ان سے کہیئے کہ انبیاء کی یہ جماعت تو گذر چکی اور اپنے رب کے پاس پہنچ گئی، انھوں نے جو کچھ کیا تھا اس کا بدلہ اللہ انھیں دے گا، تم اگر کچھ اور نہیں کر سکتے تو کم از کم ان کی طرف غلط باتیں تو منسوب نہ کرو، تم سے ان کے اعمال کے بارے میں کچھ نہیں سوال ہوگا، تمھیں آخر ان کی اتنی فکر کیوں ہے

بحمد اللہ پارۂ اول ختم ہوا

مفید کتابیں

رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر قاضی سلیمان منصور پوری رح کی شہرۂ آفاق کتاب کا مختصر تعارف یہ ہے کہ اہل علم اسے علمی اعتبار سے مستند مانتے ہیں اور انداز بیان دل کشی، رچاؤ اور دروبست کے لحاظ سے یہ اپنا جواب آپ ہے۔ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا اسلوب ستھرا اور نکھرا ہوا فکر۔ عبارتیں رواں، شگفتہ اور دلنشین مدت سے یہ قیمتی کتاب نایاب تھی اب خاص اہتمام کے ساتھ تین جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔ قیمت مکمل غیر مجلد بیس روپے۔ (مجلد تین جلدوں میں پچیس روپے)

باندیوں کا مسئلہ (اللّٰدُّ الثمین) جہاد میں ہاتھ آئی ہوئی عورتوں کو باندی بنا کر رکھنے کی دینی و علمی حیثیت۔ کتاب کے مصنف کا ایک خط اور مولانا ابو الکلام آزاد کا جواب بھی شامل ہے قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

فلسفۂ دعا، مصنفہ فضل احمد عارف قیمت چار روپے

الفرقان مشیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رح کے ایک روح نواز رسالے کا اردو ترجمہ جس میں کرامت و بزرگی کی علامات اور ولایت کی حقیقت پر لاجواب گفتگو کی گئی ہے مجلد مع حسین کور قیمت چار روپے

اشرف الجواب مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح کی طرف سے بعض سوالوں کے اہم جواب۔ مکمل ۳ حصے۔ قیمت چھ روپے۔

غنیۃ الطالبین شاہ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے شہرۂ آفاق مضامین عالیہ۔ عربی اور اس کا سلیس ترجمہ ساتھ ساتھ۔ لاجواب تحفہ۔ دو ضخیم جلدوں میں قیمت مکمل ۲۴ روپے

مسلم شریف اردو مع عربی لیجیے حدیث کی مشہور و مستند کتاب مسلم شریف کا بھی اردو ترجمہ لیجیے۔ بلکہ اس کی جو شرح، شرح نووی کے نام سے مشہور ہے اور تمام مدارس میں چل رہی ہے اس کا بھی ترجمہ ساتھ ہی شامل ہے ترجمہ کیساتھ متن بھی۔ مکمل چھ جلدیں ہدیہ اڑتالیس

ملنے کا پتہ:۔ بیت الحکمت دیوبند

Marfat.com

ابن ماجہ اردو کامل
حدیث کی جو چھ کتابیں صحاح ستہ کے نام سے مشہور ہیں ان میں کی ایک ابنِ ماجہ بھی ہے۔ اس کا عام فہم اردو ترجمہ صرف بارہ روپے میں

امام مظلوم سیدنا عثمان رضؓ
خلیفۂ ثالث، دامادِ رسولؐ شہید مظلوم کی محققانہ داستانِ حیات، آپؓ کے اوصاف، مناقب، امتیازات، گمراہ کن روایتوں کی تردید اور مستند روایتوں کی تفصیل۔ اردو میں اس موضوع پر واحد مفصل کتاب دو حصوں میں قیمت دس روپے۔

فتوح الغیب
شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے مقالات کا اردو ترجمہ۔ قیمت ڈھائی روپے۔

ردّ بدعت
حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے فرمودات کی روشنی میں بعض ایسی بدعات کا رد جو عوام ہی میں نہیں خواص میں بھی مقبول و مروّج ہوئی ہیں۔ قیمت سوا روپیہ ۱/۲۵

حیاتِ انورؒ
فخر المحدثین مولانا انور شاہ صاحبؒ کا مفصل تذکرہ۔ آپ کے علمی کمالات کا نقشِ جمیل۔ قیمت چار روپے۔

حقوق الاسلام
اپنے وقت کے زبردست عالم قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح کی مفید ترین تصنیف جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کی رُو سے کس پر کس کا کیا حق ہے، اللہ، رسولؐ، صحابہؓ، علماء، والدین، اقربا، حاکم، شوہر، بیوی، اولاد، پڑوسی، غرض ہر ایک کے حقوق کی تفصیل۔ رسالہ سماع و مزامیر بھی شامل کتاب ہے۔ اردو ترجمہ عام فہم مجلد دو روپے۔

بدعت کیا ہے؟
بدعتوں کے رد اور سنتوں کے اثبات میں ایک مشہور و مقبول کتاب عرس، قوالی، تیجہ، چہلم، الا بلا سب کے لیئے چیلنج۔ مجلد تین روپے

عمرو بن العاص رضؓ
اس صحابی رسولؐ، فاتح مصر، تلوار کے دھنی اور بلند پایہ مدبر کی داستان حیات جسے خود اللہ کے رسول نے "مدبر اسلام" کے خطاب سے نوازا۔ بے حد دلچسپ، اثر انگیز اور مستند مجلد سوا دو روپے ۲/۲۵

مقالات شیخ الہندؒ
وحی کی حقیقت اور ایمان و دیانت کے باہمی ربط پر ایمان افروز گفتگو مشہور محدث مولانا محمود الحسن شیخ الہندؒ کے قلم سے۔ قیمت ایک روپیہ۔

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک
از مولانا مسعود عالم ندوی۔ قیمت ڈھائی روپے۔

محمد بن عبدالوہاب
ایک مظلوم اور بدنام مصلح کی مستند سوانح۔ مولانا مسعود عالم ندوی کے قلم سے۔ قیمت ۲/۷۵

محاسنِ اسلام
اسلام کی خوبیوں پر مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح کی ایمان افروز تقریر۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ ۱/۵۰

عبقات
اختلافی موضوعات اور علوم تصوف پر شاہ اسمعیل شہید رح کی مشہور کتاب ترجمہ از مولانا مناظر احسن گیلانی۔ قیمت ساڑھے دس روپے ۱۰/۵۰

ملنے کا پتہ:- بیت الحکمت دیوبند (یو.پی)

Marfat.com

زبدۃ المناسک

حج اور احکام حج پر مفصل و مدلل کتاب ۔ مصنفہ استاذ الاساتذہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ۔ ہدیہ مجلد آٹھ روپے ۔

بلاغ المبین اُردو

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی رح کی ایک ایمان افروز کتاب جو شرک و بدعت کے رد میں شمشیر بے نیام سمجھی گئی ہے قیمت چار روپے ۔

حیاتِ ابوحنیفہ رح

امام اعظم رح کے علم و فضل، مدارک فکر، کمالات اور خصوصیات پر مصر کے جلیل القدر محقق استاذ ابوزہرہ کی لاجواب تالیف جس کا اردو ترجمہ رواں اور سلیس ہے ۔ قیمت مجلد پندرہ روپے

زاد المعاد چار حصوں میں

مصنفہ حافظ ابن قیم رح سیرت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دنیا کی مشہور اور مستند اور عظیم الشان کتاب ۔ یہ تاریخ کا وہ ماخذ ہے کہ جس کو نظر انداز کر کے سیرت کے موضوع پر لکھا ہی نہیں جا سکتا ۔ قیمت مکمل چار حصے

چوالیس روپے پچھتر پیسے ۴۴/۷۵

اسلام کیا ہے ؟	دو روپے
دین و شریعت	تین روپے
تذکرہ مجدد الف ثانی رح	چار روپے
مکتوبات خواجہ معصوم سرہندی رح	چار رو
ملفوظات مولانا محمد الیاس رح	۱/۵۰
مولانا الیاس رح کی دینی دعوت	۲/۵۰
قرآن آپ سے کیا کہتا ہے	چار روپے
برکات رمضان	پچھتر پیسے
نماز کی حقیقت	ایک روپیہ

تاریخ اسلام کا مکمل کورس

تاریخ اسلام کا یہ سلسلہ جو تاریخ ملت کے نام سے مشہور ہے اور مقبول خواص و عوام ہو چکا ہے ۔ مختلف خصوصیتوں کے لحاظ سے نہایت ممتاز ہے ۔ زبان کی سلاست، ترتیب کی دل نشینی اور جامعیت اس کی ایسی خصوصیتیں ہیں جو آپ کو اس سلسلے کی دوسری کتابوں میں نہیں ملیں گی ۔ خلفاء اور سلاطین کی شخصی زندگی کے سبق آموز واقعات کو اس میں اہتمام کے ساتھ اُجاگر کیا گیا ہے ۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد تاریخ اسلام کے تمام ضروری اور مستند حالات سامنے آجاتے ہیں ۔ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں داخل ہونے کے لائق کتاب

جلد اول	نبی عربی	ایک روپیہ آٹھ آنے
" دوم	خلافتِ راشدہ	تین روپے آٹھ آنے
" سوم	خلافتِ بنی امیہ	تین روپے آٹھ آنے
" چہارم	خلافتِ ہسپانیہ	دو روپے
" پنجم	خلافتِ عباسیہ اول حصہ	تین روپے بارہ آنے
" ششم	" حصہ دوم	چار روپے بارہ آنے
" ہفتم	تاریخ مصر	تین روپے چار آنے
" ہشتم	خلافتِ عثمانیہ	تین روپے چار آنے
" نہم	تاریخ صقلیہ	ایک روپیہ بارہ آنے
" دہم	سلاطین ہند اول	تین روپے آٹھ آنے
" یازدہم	" دوم	تین روپے آٹھ آنے

قیمت مکمل سیٹ غیر مجلد اکتیس روپے آٹھ آنے

" " مجلد چونتیس روپے

شاہ اسمٰعیل شہید پر اہل بدعت کے الزامات — پچھتر پیسے

ملنے کا پتہ:۔ بیت الحکمت دیوبند (یو۔پی)

Marfat.com

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ

اور یہ ایک کتاب ہے جسکو ہم نے بھیجا ہے، خیر و برکت والی ہے

تفسیر
ابن جریر اردو

تالیف

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری

اردو ترجمانی

ظہور الباری اعظمی

ناشر

دیوبند (یوپی)
بیت الحکمت

Marfat.com